مجلۂ علوم اسلامیہ

جلد ۱۸ نمبر ۱ و ۲

سنہ ۱۹۹۳ء

ادارۂ علوم اسلامیہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ

جلد ۱۸ نمبر ۱ و ۲

مجلۂ علوم اسلامیہ

سنہ ۱۹۹۳ء

مجلہ علوم اسلامیہ

مجلۂ علوم اسلامیہ

۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

مقالات :

معلومات و مراسلات :

جدید مطبوعات :

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ

قطعات تاریخی کی ایک اہم تالیف : 'مخبرالواصلین'

نذیر احمد*

شاہجہان بادشاہ (۱۰۳۷-۱۰۶۸ھ) کے دور میں ایک منظوم کتاب "مخبرالواصلین" کے نام سے اکبرآباد میں مرتب ہوئی۔ اس میں حضور اکرم کے عہد سے لیکر[۱] (پہلی روایت کے اعتبار سے) ۱۰۶۶ھ تک اور دوسری روایت کے اعتبار سے ۱۱۰۵ھ تک کے مشاہیر کی وفات پر تاریخی قطعات شامل ہیں[۲] (چند قطعوں میں تاریخ ولادت بھی پائی جاتی ہے)۔ مصنف کا نام محمد فاضل اکبرآبادی ہے، پورا نام دیباچۂ کتاب میں اس طرح درج ہے:

" ابو عبیداللہ محمد فاضل بن سید احمد بن سید حسن الحسینی الترمذی الاکبرآبادی المدعوبہ "مظہرالحق" . محمد فاضل ترمذی اکبرآبادی کا ذکر تاریخ و تذکرہ کی کتابوں میں نہیں ملتا، البتہ خود مخبرالواصلین میں مصنف نے اپنے اور اپنے خاندان کے بارے میں کافی وقیع معلومات فراہم کردی ہیں۔ محمد فاضل[۳] کا سلسلۂ نسب ۳۱ واسطوں سے حضرت علی تک پہنچتا ہے۔ اس نے اپنا نسب نامہ اپنے والد

---

* پروفیسر نذیر احمد، سابق صدر، شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

(۱) ابتدا کی تاریخ ۱۰۶۰ ہے جو کلمہ "مخبر الواصلین" سے نکلتی ہے۔ پہلی روایت کا نمائندہ نسخۂ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد (فہرست ج ۵، ص ۱۵۲-۱۵۷) ہے اور دوسری کا مطبوعہ نسخہ ۱۳۰ صفحات کا ہے۔ یہ کتاب اکبرآباد میں لکھی گئی۔

(۲) یہ قطعے حمد، نعت، منقبت خلفائے راشدین اور مدح شاہجہان کے بعد سے آخر کتاب تک ملتے ہیں۔ مطبوعہ کتاب میں دیباچہ اور حمد و نعت وغیرہ ۲۲ صفحے تک ہے۔

(۳) وفات ۱۰۶۲، مدفن اکبرآباد، تاریخ وفات " شد بجنت میر احمد" اور "قطب مشایخ" سے نکلتی ہے (مخبر، مطبوعہ، ص ۹۶)۔

کی وفات کے قبل ہی درج کر دیا ہے یہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

محمد فاضل[1]
|
سید احمد
|
سید حسن
|
سید قطب‌الدین
|
سید عبداللہ
|
میر محمود ترمذی
|
حامد
|
محمد
|
امیر احمد
|
عصام‌الدین
|
حسام‌الدین
|
نقیہ‌الدین
|
وجیہ‌الدین
|
بو علی

گر شماری تو نامهای کرام   می و یک می شود بغیر تمام
من و فرزند من بان کرسی   می و یک می شویم گر پرسی
(مطبوعہ ص ۹۲)

---

(۱) ص ۹۰-۹۲ (مطبوعہ نسخہ).

اور ماں کی طرف سے مظہرالحق کا سلسلۂ نسب ۲۸[۱] واسطوں سے حضرت علی تک پہنچتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

ماهر

|

ابو محمد

|

سید ابراهیم

|

خلیل

|

سلیم

|

شاہ نعمت اللہ

|

شاہ عظمت اللہ

|

حامد

|

حسین

|

میر مرتضی

|

شاہ نور

|

شاہ ولی

|

شاہ حیدر

|

شاہ علی

|

عبداللہ

|

---
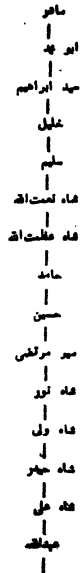
(۱) مطبوعہ نسخہ، ص [illegible]۔ احمد ترمذی پدر مؤلف نصیب الطرفین سید تھا۔

احمد
|
جعفر
|
محمد
|
قاسم
|
حسن
|
عیسیٰ
|
محمد اکبر
|
علی بن جعفر
|
جعفر
|
باقر
|
زین العابدین
|
امام حسین
|
حضرت علی

خاندان کے دوسرے افراد میں ان کا ایک چھوٹا بھائی عاقل نامی تھا، جس کی وفات (۱۰۹۲ ھ) پر ایک قطعہ مخبر الواصلین کے دوسرے ایڈیشن (مطبوعہ، ص ۱۲۲) میں منقول ہے. عاقل کے دو بیٹے سید محمد اور سید میر تھے، اور دو لڑکیاں تھیں. مظہرالحق کی بیوی بھی سیدہ تھی، اس کے باپ کا نام میر عبدالعظیم اور دادا کا میر سہدی تھا. آخرالذکر سید علی ہمدانی کی اولاد میں تھے اور ماں کی طرف سے ان کی بیوی کا سلسلہ علامہ سید شریف تک پہنچتا ہے (ص ۹۰).

●

منظہرالحق نے اپنی ماں کا پدری و مادری سلسلۂ نسب بھی اس طرح درج کیا ہے:

پدری سلسلۂ

مادر
|
شیخ[1] فتح اللہ حسینی (ساکن دکن) وفات ۱۰۲۸ھ
|
محمد بن علی
|
عباس بن شاہ ولی
|
شاہ ابو الفتح
|
عبداللہ
|
شاہ میر
|
سید شاہ
|
عبدالرحیم
|
نورالحق
|
ظہورالحق
|
جعفر
|
انور
|

---

(۱) باپ کی طرف سے حسنی اور ماں کی طرف سے موسوی (ص ۸۰). اس نے ۱۰۲۸ھ میں ۹۰ سال کی عمر میں حج کے موقع پر انتقال کیا.

شاہ عبداللہ

|

کمل ابن میران شاہ

|

عبداللہ

|

احمد

|

جعفر

|

بو محمد

|

عبدالرزاق

|

محی الدین غوث الاعظم

|

بو صالح

|

شاہ عبداللہ

|

شیخ یحیی زاہد

|

شیخ محمد سیف اللہ

|

داؤد

|

موسیٰ

|

عبداللہ

|

موسیٰ

|

عبداللہ

|

حسن مثنیٰ

|

امام حسن
|
حضرت علی

بقول صاحب مظہرالواصلین ماں کا پدری نسب ۳۳ واسطوں سے حضرت علی تک پہنچتا ہے، لیکن جو نام درج ہیں وہ فقط ۳۹ ہیں (مظہر الواصلین، ص ۸۰-۸۱).

مظہرالحق کی ماں کا مادری سلسلہ یہ ہے:

بزرگ سید
|
نورالدین محمود
|
صالح
|
شاہ علی
|
موسیٰ
|
میر ولی
|
نورالحق
|
نظام الدین
|
عبدالحق
|
قوام الدین
|
جعفر
|
ابراہیم
|
باقر
|

(۱) مظہرالواصلین ص، ۸۱ ۔

شاہ سلیم
|
جلال الدین
|
کمال الدین
|
محمد شاہ
|
عظیم اللہ
|
جلیل
|
محمد اسمٰعیل اسماعیل
|
سید محمد
|
قاسم بن حمزہ
|
حمزہ بن موسیٰ کاظم
|
جعفر
|
باقر
|
زین العابدین
|
امام حسین
|
مرتضیٰ علی

مظہرالحق نے اپنے باپ کو مدنی، عریضی، ہروی، ترمذی، حسینی، علوی لکھا ہے (ص ۹۲) اور ان کی نجیب الطرفین سیادت پر بڑا فخر کیا ہے۔ اصل خاندان کی جائے سکونت کے بارے میں یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

از عرب آمدند در ایران پس ز ایران بخطهٔ توران
باز در ملک هند کرده قرار هریکی زان بزرگهای دیار
(ص ۹۳)

اپنے اور اپنے والد کے بارے میں یہ مفید اطلاع بہم پہنچائی ہے:

ذات او بود سید الطرفین نور معدنین و لؤلؤ بحرین
مولد او سیالکوٹ بدان اکبرآباد گشت مسکن آن
لیک جد کلاں آن شه هین ترمذی است با فر و تمکین
مولد من که زود لم‌فساد امت شهر پر فیض اکبرآباد است
مسکنم نیز اندرین شهر است بینم آخرچه گردش دهر است
یا دران شهر مدانم سازد یا دگر خطه مسکنم سازد

مطبوعہ نسخے کے آخر میں مظہرالحق کے بھتیجے کے قلم سے ایک تحریر ہے جو مصنف کی وفات کے بعد لکھی گئی، اس میں مزید ان کی تاریخ وفات بھی درج ہے، لیکن مجھے نہ نثری حصہ میں اور نہ منظوم قطعے میں مظہرالحق کی تاریخ وفات مل سکی. البتہ اتنا طے ہے کہ وفات ۱۱۰۵ ہجری کے بعد ہوئی، اس لیے کہ مخبرالواصلین میں آخری مندرج شخصیت میر حسینی ہیں جن کی وفات کے قطعے سے ۱۱۰۵ ہجری تاریخ نکلتی ہے (ص ۱۳۰)؛ ظن قوی یہی ہے کہ ان کی وفات آگرہ ہی میں ہوئی ہوگی. اس آخری عبارت کا کچھ حصہ درج ذیل ہے:

بر ارباب دانش و اصحاب بینش مخفی و محتجب[1] نه ماند که اگرچه انجام این نامهٔ نامی و اختتام این صحیفهٔ گرامی را مانند

(۱) یہ ٹکڑا مقدمۂ کتاب سے ماخوذ ہے: بر ارباب دانش و بینش محتجب و مخفی نماند که.... تاریخ آغاز این نسخهٔ منظومه بقلمی که مسطور و مذکور است مرقوم گردیده و تاریخ انجامش چون ایام قیامت بانصرام نرسیده. (مطبوعه ص ۱۲).

انجام نهایت نه حدی معین است و نه وقتی مقرر، امتداد این
سر رشته تا به انقضای زمان و انتهای دوران ممکن است و متصور اما
کسی که مخترع این طرز غریب و واضع این اسلوب عجیب
بود اعنی سپهر سپهر فضل و کمال و ماه برج فضیلت و افضال
سالک مسالک طریقت و واقف اسرار حقیقت، مرکز دایرهٔ دانش و
آگهی، دایرهٔ مرکز معرفت الهی، زنندهٔ مسند جاه و جمال شاه
سریر رفعت و اجلال... مظهر الحق و الحقیقت بانی مبانی شریعت و
طریقت مخدومی و عمی عارف کامل حضرت میر سید محمد فاضل
قدس الله سره العزیز بحکم آیهٔ کریمه 'کل نفس ذائقة الموت' آفتاب
جهانتاب نفس صفاتش، سر در نقاب مغرب ممات کشیده....
بناءً علیه این چند ابیات که مشتمل بر تاریخ ارتحال آن ستوده
خصال علیه المغفرة من الله المتعال که بر خاطر فاتر این بنده
خطور کرده بمنزلهٔ خاتمهٔ کتاب گردانید...

عارف حق لما بحق واصل   مظهر الحق محمد فاضل
عمدهٔ دودمان مصطفوی   زبدهٔ خاندان مرتضوی
آنکه ذاتش یگانهٔ آفاق   بود در علم و فضل و دانش طاق
علم صوری و معنوی می داشت   حل ناکرده عقدهٔ نگذاشت
جودت از طبع او شرف یا بست   همچو گوهر که قدرش از آبست
لب او ترجمان لوح و قلم   دل او رازدان سر قدم
دست او همچو ابر نیسان بود   منبع جود و بحر احسان بود
ذات او فیض بخش عالم بود   بخشش آموز معن و حاتم بود

اسی بیت پر خاتمے کی عبارت ختم ہو جاتی ہے، واضح ہے کہ
یہ قطعہ نا تمام ہے، اور اس میں وہ بیت جس میں قطعۂ تاریخ تھا،
محذوف ہے۔

خزینۃ الاصفیا میں مخبرالواصلین کے کافی اشعار حاشیہ میں اور
کچھ اشعار و واقعات متن کتاب میں درج ہیں۔ اسی کتاب سے معلوم
ہوا کہ محمد فاضل نے ایک اور کتاب تذکرۃ الشعرا بھی لکھی تھی
جو نثر میں تھی۔ ملاحظہ ہو:

صاحب تذکرة الفقرا که مصنف مخبرالواصلین هم است و می فرماید که وحوش و طیور و دیو و پری همه معتقد فرمان شیخ ناظر بودند»
(ج ۲، ص ۳۳۸)
وفات شیخ [ناظر] بقول صاحب مخبرالواصلین و تذکرة الفقرا بتاریخ سیزدهم جمادی الاول سال یک هزار و پنجاه و هفت هجریست و مزار پرانوار در اکبر آباد است (ج ۲، ص ۳۳۹).

پہلے بیان کے تسلسل کے طور پر آیا ہے:

و درج کتاب مذکور است که روزی در محفل شیخ (ناظر) ذکر کیمیا می شد، شیخ قدری خاک از زمین برداشت و بدست خادمی داد، چون دید زر خالص بود، همچنین روزی پارهٔ برف در نظر کیمیا اثر وی زمرد سبز گردید و دانه‌های تسبیح در دست حق پرست وی یاقوت و مروارید شدند (ص ۳۳۴-۳۳۸).

«مخبرالواصلین» اس کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۰۶۰ هجری تاریخ نکلتی ہے، لیکن یہ اس کے شروع کرنے کی تاریخ ہے، خاتمے کی تاریخ نہیں۔ کتاب شاهجہان کے وقت میں لکھی گئی چنانچہ اس کی مدح میں بھی چند شعر پائے جاتے ہیں۔ حمد و نعت و منقبت کے بعد ”در مدح پادشاہ زمان یعنی شاہجہان پادشاہ غازی“

---

(۱) اس کے بعد پانچ اور واقعات شیخ کے خرق عادت کے درج کئے ہیں، بخوبی ممکن ہے کہ یہ واقعات بھی تذکرة الفقرا کے ہوں (ص ۳۳۸)، لیکن مخبرالواصلین مطبوعہ ص ۸٦ میں شیخ کے خوارق کے بارے میں یہ اشعار ہیں:

خاک را از نظر طلا می کرد   آب را شیر تا صفا میکرد
دانهٔ سبحه در کفش گردید   عاقد یاقوت و لعل مروارید
ابر را هر کجا که می فرمود   بارش آنجا باعتدال نمود
ناظر نوجوان که بچه نزاد   شیخ زو شیر را بمردم داد
کودک مرده را به نیم نگه   زنده کرد آن ولی حق آگه
طرفةالعین سیخ عرگهی می شدی از نگاه او ماهی

شاہ جہان بادشاہ ان سے اتنا متاثر تھا کہ انکو حرم شاہی میں جانے کی اجازت تھی:

شیخ را راه بود بی اکراه در حرمگاه خاص شاهنشاه

کے ذیل میں لکھتا ہے:

در زمان شہ ستودہ سیر	عادل و باذل و ہنر پرور
زبدۂ خاندان تیمور است	خلق زو شادو ملک معمور است
ثانی صاحب قران است او	ہر چہ گویم بوصف آن است او
رونق افزای ملک ہندوستان	شد وجود شریف شاہ جہان
مختصر نسخۂ نگشتہ ام	گل و ریحان تازہ کشتہ ام
مخبر الواصلین نہادم نام	نام این نسخۂ نکو فرجام
چون تو تاریخ او زمن خواہی	نام اورا شمر گر آگہی
مخبر واصلان حق است این	مشعر مائلان حق است این
اندرین نسخہ آنچہ پنہان است	ذکر خیر خدا پرستان است
سال مولود و نقل دینداران	اندرین نسخہ گفتم ای یاران

(ص ۲۱)

مخبر الواصلین کی ترتیب کے سلسلے میں مرتب نے دیباچے میں لکھا ہے کہ میرے بعض دوستوں نے اصرار کیا کہ چونکہ حضور اکرم، خلفاء راشدین اور ائمہ اور دوسرے اصحاب کی تاریخیں خاصی اختلاف آرا ہیں، اس لیے ایک ایسی کتاب کی شدید ضرورت ہے جس میں یہ تاریخیں ٹھیک ٹھیک درج ہوں، اگرچہ اس وقت میری عمر صرف ۱۸ سال کی تھی، اور مجھے اس کام کی نہ صلاحیت تھی اور نہ فرصت، لیکن دوستوں کے اصرار سے مجبور ہو کر میں نے اس کام کو شروع کر دیا، پھر اپنے والد اور اپنے شیخ کے ارشادات بھی اس میں جمع کر لیے، مگر بعض وجوہ سے یہ مسودہ مکمل

---

(۱) و درین ایام خجستہ انجام عمر این احقر از ہژدہ سالگی تجاوز نمودہ و بتحصیل علوم نقلیہ و عقلیہ فارغ گشتہ و بحصول علم معرفت الہی کمر سعی بر بستہ و نعمت لا متناہی از ہر جا گرفتہ تا بحد کہ تلقین روحانی از ارواح اکثری از رجال‌اللہ حاصل شدہ و سرور وفور از مجالست معنوی بفیض سرمدی یافتہ، بعض سبب این مسودہ بر صفحہ بیاض روزگار خال چہرۂ اہل اعراض شدہ (ص ۱۱)

نہ ہو سکا۔ ۱۰۳۵ھ سال بعد اپنے بیٹے سید عبداللہ کی خواہش پر ایک ہفتہ میں ساری تاریخیں نظم کیں اور اس میں ان بزرگوں کو بھی شامل کر لیا جن کی خدمت میں میں نے حاضری دی تھی۔ ملاحظہ ہو:

بعد از سی و پنج سال باز بخواہش فرزند ارجمند، سید عبداللہ سلمہ اللہ۔ در یک ہفتہ این تواریخ را سلک نظم در آوردہ برخی از فرقۂ مشائخ کرام و اولیاء عظام را کہ این نیازمند درگاہ الہی ملازمت آنہا ارتباط معنوی رسانیدہ و کیفیت حال خیرمآل ایشان دیدہ ہم درین منظومہ بحیز تحریر آورد (ص ۱۱)۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ مخبرالواصلین ۱۰۶۰ھ میں شروع ہوئی، اور کافی بعد تک اس میں اضافے ہوتے رہے۔ نسخۂ سالار جنگ میں آخری شخص شیخ محمد صالح (مرشد مصنف مخبرالواصلین) ہے جس کی وفات ۱۰۶۷ کی ہے، گویا یہ نسخہ اسی سنہ میں تیار ہوا لیکن مطبوعہ نسخے میں آخری شخص میر حسینی ہے جس کی تاریخ وفات ۱۱۰۵ھ ہے۔ اسی بنا پر میں نے قیاس کیا ہے کہ صاحب مخبر اس سال تک ضرور زندہ رہا، اور اس وجہ سے اس کی وفات ۱۱۰۱ جو اسپرنگر وغیرہ کے یہاں بیان ہوئی ہے، درست نہیں معلوم ہوتی۔ مطبوعہ نسخہ میں محمد صالح کے بعد ۸۱ اشخاص کی تاریخ وفات مزید شامل ہوئی ہے، ان میں پہلی شخصیت عبدالحکیم سیالکوٹی اور آخری میر حسینی کی ہے۔ اس میں شاہجہاں بھی شامل ہیں جن کا نام کتاب کے شروع میں آچکا ہے، اس کے علاوہ ممتاز شخصیات میں ملا شاہ، حکیم سرمد، دارا شکوہ، شاہ پیر محمد لکھنوی، میر مومن خوشنویس، سید محمد عاقل برادر مصنف، شاہ عالم، قطب عالم، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

---

(۱) اگر پہلی کوشش جب کہ مصنف ۱۸ سال کا تھا، کے بعد مراد ہے تو اس وقت اس کی عمر ۵۳ سال کی ہوتی ہے، اگر ۱۰۶۰ میں وہ ۵۳ سال کا تھا تو تاریخ ولادت ۱۰۰۷ ہوتی ہے اگر یہ ٹھیک ہے تو ۱۱۰۵ میں اس کی عمر ۹۸ سال ہوتی ہے، بہر حال یہ بات مزید تحقیق چاہتی ہے۔

مخبر کے تین بار طبع ہونے کا علم ہے۔ ۱۲۶۵ھ میں مصطفائی پریس، لکھنو میں چھپی جس کا ذکر اسپرنگر نے اودھ کیٹلاگ میں ص ۵۹۰ پر کیا ہے، پھر اس کے تیسرے ایڈیشن کا بھی، لیکن تیسرے ایڈیشن سے معلوم ہوا کہ اس سے پہلے ایک ایڈیشن ۱۲۳۹ھ میں کلکتہ میں ٹائپ میں چھپا، تیسرا ایڈیشن ۱۳۸۵ھ سے دلی میں خواجہ لیتھو پریس میں مسلم احمد نظامی کے زیر اہتمام چھپا، اس کا حجم ۱۰۰ صفحے کا ہے۔

مرتب مخبر الواصلین کے استاد اور پیر، محمد صالح اکبرآبادی تھے جن کا کئی بار تذکرہ مخبر الواصلین میں آچکا ہے۔ پہلی بار دیباچہ میں "عمدۃ العارفین قطب الفاضلین ارشاد پناہی" کے عنوان سے (ص ۱۱) دوسری بار مقدمے کے بعد کے اشعار میں اس طرح:

صورت حال آمدہ در قال من نیست بیرون قال من از حال من
این همه حالت که مرا رو نمود از مدد و موہبت پیر بود
پیر که آن ہادیٔ راہ خدا است در همه شیخان جہان مقتداست
شیخ فلک مرتبہ صالح بنام هست مرا مرشد عالی مقام
چشم خدا بین شده پر نور ازو اهل حقایق شده مسرور ازو
سینۂ او مخزن اسرار بود جبہۂ او مطلع انوار بود
تاکه بود کرسی و لوح و قلم رحمت حق باد برو دم بدم
(ص ۱۳-۱۴)

پھر ایک عنوان کے تحت جس میں کئی ذیلی سرخیاں ہیں پیر کے حالات و کوائف لکھے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

شیخ ما عارف است ربانی از مریدان شاہ جیلانی
شیخ صالح که ماہ عرفان است مطلع نور و چرخ فیضان است
جز خدا با کسی نبودش کار بخدا بی‌خدا بنودش یار
عالم و عارف خدا بوده تابع شرع مصطفیٰ بوده
علم معقول و نکتۂ منقول از برش بود با فروع و اصول

درس می گفت از برای خدا   شغل او علم بود صبح و مسا
تابع شرع بود درهمه حال   قال او بود حال حالش قال
(ص ۹۸-۹۹)

شیخ ما مظهر کمالات است   صاحب کشف و هم کرامات است
در تو کل ز بس که پا افشرد   گوی خوبی زهر دو عالم برد
او مرا رهنمای حق گردید   پایه ام زین سبب بعرش رسید
آنچه او نعمتی مرا که سپرد   شکر او کی توان بجا آورد
گر زبانم یکی هزار شود   هر هزارش سخن گزار شود
شکر اورا شمار نتوان کرد   بلکه یک از هزار نتوان کرد
صرف و نحو و حدیث و فقه اصول   علم معقول و هیئت و منقول
علم یکسیر و وفق و جفر و رمل   طرز جبر و خفی بکسب عمل
جبر و تقسیم و فن لیرنجات   طب و تشریح و نبض و قاروورات
نسق و تعلیق و ثلث و نسخ دگر   خط گولی و هم خط احمر
همه را یافتم بخدمت او   لهر من شد زبحر همت او
او مرا رهنما بحقی شد   پایه ام فوق عرش اعلی شد
او مرا شغل باطنی فرمود   آنچه میخواستم عیان بنمود
ظلمت من ازو منور شد   مس من زو طلای احمر شد
او مرا بود مرشد و استاد   او مرا علم داد هم ارشاد
شده از التفات او بخدا   در من قبله که شاه و گدا
هر یکی را رجوع بر در ماست   این همه از طفیل او پیداست
وصف او برترست از تقریر   منحص الزون تر است از تحریر
زین جهان رفت با نکونامی   قدس الله سره السامی
ماه ذی قعد بود سیزدهم   که به آدینه شد به چرخ نهم
سال سفارش از جهان دو رو   شاهباز مقام عرش بگو
شد رقم سال نقل آن فالح   در جهانست مسکن صالح
سال تلفظی بعزت و مکنت   جای صالح سرایر جنت
سال تاریخ نقل آن خوشرو   رونق شرع بود صالح گو
سال تلفظی بروی صدق و صواب   شد رقم بود افضل الاقطاب
مرقد او که جای ارشاد است   خاص در شهر الهآباد است

مرقد او ز بشنة ساک است گنبدش دور جرم افلاک است
(ص ۱۱۱-۱۱۲)

شیخ ما صاحب عمل بوده پاک از مکر وز حیل بوده
ظاهر حال آن خدا آگہ بود قال الرسول قال اللہ
مطلق محو ذات مطلق بود سخن حق شنو کہ با حق بود
نسبتش هاشمی و مطلبی است حسبش نبوۂ خدا طلبی است
(ص ۸۰۸)

شیخ صالح اور مرتب مخبرالواصلین رقص و سرود اور سمع کو ناجائز جانتے تھے

بوحنیفه که فرد مجتهدین بود در عرصۂ زمان و زمین
مالک و شافعی و هم احمد یوسف و هم محمد امجد
بیشک و ریب آشکار و نهفت سر غنا را حرام مطلق گفت
بر شکر گنج و بر نظام الدین تهمت وجد و رقص است یقین
قطب و بسی نبود از اصحاب که ازین فعل و رسم شد به ثواب
بدترین از همه گناه است این تهمت رقص بر معین الدین
شرم کن زین طریقۂ بیجا عارفان را باین مکن رسوا
اشهدی که از سماع و غنا به حسن زجر کرد شیر خدا
اشهدی که از فروع و اصول لعن بر صوت و لحن کرد رسول
(ص ۱۰۲)

شیخ صالح بڑے صاحب نظر تھے، وہ بعض اچھی کتابوں کو بھی غیر معیاری جانتے، یہاں تک کہ عبدالحق محدث دھلوی کی اخبار الاخیار بھی ان کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھی۔

اس سلسلے کے چند شعر ملاحظہ ہوں (ص ۱۰۹-۱۱۰)

شیخ ما صاحب نسب بوده شاهد حال او حسب بوده
فالفرض مائل هنر می بود همچو آئینه عیب کس ننمود

بحر السلوک و معدن الاخبار معتبر نیست ای ستوده شعار
فاضل بی‌نظیر عبدالحق وازدان مقید و مطلق
کملالی که خطهٔ هنداند واصلالی که خطهٔ هنداند
ذکر کردست حال هر یک را وفع ناکردهٔ نقطهٔ شک را
چند جا کرده آن عزیز غلط بر خط راست کج نهاده نقط
می نویسد هر آنکه بی تحقیق بدتر است از عشایر زندیق
این چنین بد بود بنزد خدا که ز بد نیک را نکرده جدا
بسوادیکه بود نورالحق داشت از روی علم نیک نسق
من باو گفتم ای ستوده شعار پدرت گفته نسخهٔ اخبار
لیک بر صحتش نه پی برده این چنین حیف آنچنان کرده
او بمن از کمال صدق و صواب داد از راه اعتقاد جواب
که به تصحیح آن کتاب نظر از ضعیفی نکرد بار دگر
همچنین از طفیل شاگردان شهرتی یافت است نسخهٔ آن
اینچنین گفتنش سند نبود بد از و نیک و نیک بد نبود
بر کم و بیش او خدای کریم ساتر آمد به لطفهای عمیم

مخبر الواصلین میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں، اس کا انداز ان سادہ ہے اور شاعرانہ پیرایۂ بیان سے یکسر عاری ۔ مصنف کو س کا بخوبی احساس تھا، چنانچہ وہ خود دیباچہ میں لکھتا ہے :

بر ارباب دانش و بینش محتجب و مخفی نماند که اگرچه این شاهد نظم از پیرایهٔ نزاکت شاعرانه و حلیهٔ صنعت فاضلانه عاری است اما به صنایع مورخانه از زیور خوبی و لباس نازکی بیرون نیست . (ص ۱۲)

جیسا عرض کیا جاچکا ہے میرے علم میں اس کے حسب ذیل لمی نسخے ہیں :

۱ - نسخهٔ سالارجنگ میوزیم، شماره ۱۸۹۴، فہرست مخطوطات فارسی، ج ۵، ص ۱۵۲—۱۵۴، اوراق ۹۲، سطر ۱۱، سایز ۵/۲×۸/۲ انچ .

ابتدا: برترین کلامی که عارفان معارف سخن‌طرازی الخ

ابتداء اشعار: این سخن چند که من گفته‌ام
گوهر ناسفته مگر سفته‌ام

نسخہ کا آخری ورق الحاقی ہے جس میں چند قطعات میر غلام علی ارشد کے اضافے کے ہیں۔

۲۔ نسخۂ ایشیاٹک سوسایٹی، کلکتہ، فہرست Ivanow، شمارہ ۷۵۹،
اوراق: ۵۰، سطر: ۱۱، کاتب: حسن بھد، تاریخ کتابت: ۱۱۵۱،
مقام کتابت: سکا نول حیدرآباد۔

ابتدا ورق ۱ ب: برترین کلامی که عارفان معارف الخ

ابتداء مثنوی ورق ۳ ب: این سخن چند که من گفته‌ام
گوهر ناسفته مگرم سفته‌ام

۳۔ نسخۂ ذخیرۂ کرزن، ایشیاٹک سوسایٹی، شمارہ ۲۶۸
اوراق: ۳۶، سطر: ۱۳، ابتداء مقدمہ و مثنوی مانند نسخہ شمارہ ۷۵۹ لیکن فہرست نگار نے اس کو اچھا نسخہ نہیں بتایا ہے۔

مخبر الواصلین کے ایک نسخے کا تعارف اسپرنگر نے فہرست اودہ (ص ۵۹۳) میں کیا ہے اس کا ذکر سب سے پہلے ریو نے برٹش میوزیم کے کیٹلاگ میں کیا تھا، اسی سے رہنمائی ملی کہ اسپرنگر نے اس کتاب کو دیکھا تھا۔ فہرست اودہ میں اس کتاب کا ذکر اس طرح پر ہے: مخبر الواصلین (۳۵۹)

Information for Aspirants[2] by Abu'abd Allah Mohammad Padhil b. Sayyid Ahmad b. Sayyid Hosayn Hosayny Tirmidzy Akbarabady who is usually called Mazhar alhaqq. He flourished under Shahjahan and

---

۱۔ فہرست میں خاتمہ (Ending) لکھا ہے، مگر کلکتہ کے دونوں نسخوں میں مثنوی اسی شعر سے شروع ہوتی ہے۔

۲۔ مخبر الواصلین کا یہ ترجمہ صحیح نہیں؛ صحیح ترجمہ یہ ہوگا: "Informer about those who have joined God after death"

composed this book as the title indicates which is a chronogram, in 1060 and died in 1101.

This book contains chronograms in verse on the principal dates in Mohammadan history, particularly on the death of great men—of the Prophet, of the Khalifs, of poets etc. Beginning برترین نامی که عارفان معارف سخن سازی و واقفان Lithographed at Lucknow, Mostafayiy press 1265, 12 mo. 130 pp..

اس بیان سے دو باتیں نہایت اہم معلوم ہوئیں ۔ ایک تو یہ کہ ابوعبد اللہ محمد فاضل کی وفات کی تاریخ ۱۱۰۱[1] ہے (ماخذ کا ذکر نہیں، لیکن فہرست نگار نے یہ تاریخ دلوں کے ساتھ درج کی ہے۔ یہی تاریخ اسپرنگر کے حوالے سے ریو اور ایوانف نے بھی لکھی ہے) دوسری اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ مخبر الواصلین ۱۲۶۵ھ میں مصطفائی پریس میں ۱۳۰ صفحے میں طبع ہو چکی ہے ۔ خزینۃالاصفیا کے مصنف کے پاس مطبوعہ نسخہ تھا جس سے اس نے اپنی کتاب کے حاشیے میں کثرت سے اشعار درج کردئے ہیں ۔

البتہ اس بیان میں یہ نقص ہے کہ اپنے نسخے کا حوالہ درج نہیں کہ وہ کس ذخیرے کا تھا ، اور اس میں کتنے اوراق تھے ۔

سالار جنگ میوزیم کے لائق فہرست‌نگار محمد اشرف نے اپنے مخطوطے کے ان اشخاص کی مکمل فہرست مع سنین وفات کے درج کردی ہے۔ یہ اطلاع نہایت مفید ہے اور اسی مقصد کے تحت وہ انگریزی فہرست اردو[2] میں منتقل کی جارہی ہے :

۱ - حضرت محمد صلعم وفات ۱۱ھ/۶۳۲ء ورق ۱۱ ب
۲ - حضرت ابوبکر صدیق ۱۳ھ/۶۳۴ء ورق ۱۲
۳ - حضرت عمر فاروق ۲۳ھ/۶۴۴ء ورق ۱۲
۴ - حضرت عثمان غنی ۳۵ھ/۶۵۶ء ورق ۱۲ ب

---

۱ - لیکن مطبوعہ نسخے میں آخری شخص جو اس نسخے میں مذکور ہے ، اس کی تاریخ وفات ۱۱۰۵ ہے اگر یہ صحیح ہے (جس میں شبہ کم ہے) تو ۱۱۰۱ ہجری تاریخ وفات نہیں ہو سکتی ۔

(۲) اس میں ۱۴۶ افراد ہیں، لیکن مطبوعہ نسخے میں ۸۰ افراد مزید بیان ہوئے ہیں، اس سے یہ فہرست ۲۲۶ پر مشتمل ہوگی ۔

۵ - حضرت علی ٣٠ھ/٦٦١ء ١٣
٦ - حضرت فاطمہ ١١ھ/٦٣٩ء ١٣ ب
٧ - امام حسن ٥٠ھ/٦٣٩ء ١٣
٨ - امام حسین ٦٠ھ/٦٧٠ء ١٣
٩ - امام زین العابدین ٩٥ھ/٧١٣ء ،،
١٠ - امام باقر ١١٣ھ/٧٣٢ء ١٥
١١ - امام جعفر صادق ١٣٨ھ/٧٦٥ء ١٥ ب
١٢ - امام موسیٰ کاظم ١٨٣ھ/٧٩٩ء ١٦
١٣ - امام علی رضا ٢٠٥ھ/٨٢٠ء ،،
١٤ - امام محمد تقی ٢٣٩ھ/٨٦٣ء ١٦ ب
١٥ - امام علی نقی ٢٥٥ھ/٨٦٩ء ،،
١٦ - امام حسن عسکری ٢٦١ھ/٨٧٣ء ١٧
١٧ - امام مہدی ٢٦٥ھ/٨٧٩ء ١٨
١٨ - امیر حمزہ ٣ھ/٦٢٣ء ١٨ ب
١٩ - حضرت عباس ٣٢ھ/٦٥٣ء ،،
٢٠ - اویس قرن ٣٩ھ/٦٥٩ء ١٩
٢١ - حسن بصری ١٠٠ھ/٧١٩ء ١٩ ب
٢٢ - حبیب عجمی ١٢٠ھ/٧٣٨ء ،،
٢٣ - امام ابوحنیفہ ١٣٠ھ/٧٦٧ء ٢٠ ب
٢٤ - امام مالک ١٧٩ھ/٧٩٥ء ،،
٢٥ - امام شافعی ٣٠٣ھ/٨٢٠ء ٢١
٢٦ - امام حنبل ٢٣١ھ/٨٥٥ء ٢١ ب
٢٧ - امام یوسف ١٨٢ھ/٧٩٨ء ،،
٢٨ - امام محمد ١٨٧ھ/٨٠٣ء ،،
٢٩ - ابراهیم ادھم ٢٦٥ھ/٨٧٩ء ٢٢
٣٠ - بایزید بسطامی ٢٦٩ھ/٨٨٣ء ٢٢ ب
٣١ - سفیان ثوری ١٥٦ھ/٧٧٣ء ٢٣
٣٢ - شقیق بلخی ١٧٣ھ/٧٩٠ء ،،
٣٣ - فضیل بن عیاض ١٨٦ھ/٨٠٢ء ،،
٣٤ - معروف کرخی ١٨٠ھ/٧٩٦ء ٢٣ ب

۳۵-	بشر حافی	۲۲۵ھ/۸۴۰ء	۲۴
۳۶-	حاتم اصم	۲۳۷ھ/۸۵۵ء	″
۳۷-	احمد خضرویہ	۲۳۹ھ/۸۵۴ء	″
۳۸-	ذوالنون مصری	۲۳۸ھ/۸۵۲ء	″
۳۹-	امام بخاری	۲۵۰ھ/۸۶۴ء	۲۴ ب
۴۰-	امام مسلم	۲۲۵ھ/۸۴۰ء	″
۴۱-	سری سقطی	۲۵۳ھ/۸۶۷ء	۲۵
۴۲-	یحیی بن معاذ	۲۴۹ھ/۸۶۳ء	″
۴۳-	منصور حلاج	۳۰۷ھ/۹۱۹ء	۲۵ ب
۴۴-	جنید بغدادی	۳۰۲ھ/۹۱۵ء	″
۴۵-	شیخ شبلی	۳۰۵ھ/۹۴۶ء	۲۶
۴۶-	اسماعیل بن حماد جوہری	۳۹۳ھ/۱۰۰۳ء	″
۴۷-	ابو سعید ابوالخیر	۳۶۱ھ/۹۷۲ء	″
۴۸-	سلطان محمود غزنوی	۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء	۲۶ ب
۴۹-	ابوالحسن خرقانی	۴۲۴ھ/۱۰۳۳ء	″
۵۰-	بو علی سینا	۴۲۸ھ/۱۰۳۷ء	۲۷
۵۱-	مرتضیٰ علم الہدیٰ	۴۳۶ھ/۱۰۴۵ء	″
۵۲-	عبداللہ انصاری	۴۷۷ھ/۱۰۸۴ء	۲۷ ب
۵۳-	امام محمد غزالی	۵۰۷ھ/۱۱۱۲ء	۲۸
۵۴-	احمد غزالی	۵۱۷ھ/۱۱۲۳ء	″
۵۵-	پیر ترک	۵۳۱ھ/۱۱۳۷ء	″
۵۶-	حکیم سنائی	۵۳۵ھ/۱۱۴۱ء	″
۵۷-	مودود چشتی	۵۳۵ھ/۱۱۴۱ء	″
۵۸-	جاراللہ	۵۵۳ھ/۱۱۵۸ء	″
۵۹-	احمد جام ژندہ پیل	۵۳۶ھ/۱۱۴۲ء	۲۹
۶۰-	یوسف ہمدانی	۵۳۳ھ/۱۱۳۹ء	″
۶۱-	سید عبدالقادر جیلانی	۵۶۱ھ/۱۱۶۶ء	۳۰ ب
۶۲-	شہاب الدین مقتول	۵۸۶ھ/۱۱۹۰ء	۳۱ ب
۶۳-	نظامی گنجوی	۵۹۲ھ/۱۱۹۶ء	۳۱
۶۴-	خاقانی	۵۹۵ھ/۱۱۹۹ء	″

٦٥ -	شاہ سبحان[1]	۵۹۷ھ/۱۱۹۱ء	۳۱ ب
٦٦ -	روز بہان	۶۰۶ھ/۱۲۱۰ء	"
٦٧ -	امام فخرالدین رازی	۶۰۸ھ/۱۲۱۲ء	"
٦٨ -	شیخ فریدالدین عطار	۶۲۷ھ/۱۲۳۰ء	"
٦٩ -	شیخ نجم الدین کبری	۶۱۸ھ/۱۲۲۱ء	ورق ۳۲
٧٠ -	شیخ معین الدین چشتی	۶۳۳ھ/۱۲۳۷ء	ورق ۳۲ ب
٧١ -	خواجہ بختیار کاکی	۶۳۵ھ/۱۲۳۷ء	ورق ۳۳
٧٢ -	شیخ شہاب الدین سہروردی	۶۳۲ھ/۱۲۳۵ء	"
٧٣ -	شیخ بہاء الدین زکریا	۶۶۶ھ/۱۲۶۸ء	۳۳ ب
٧٤ -	شیخ سعدی شیرازی	۶۹۱ھ/۱۲۹۲ء	۳۴
٧٥ -	شیخ فریدالدین گنج شکر	۶۷۰ھ/۱۲۷۲ء	۳۴ ب
٧٦ -	حمیدالدین ناگوری	۶۷۸ھ/۱۲۷۹ء	۳۵
٧٧ -	شیخ نظام الدین اولیا	۷۲۵ھ/۱۳۲۴ء	۳۳ ب
٧٨ -	امیر خسرو	۷۲۵ھ/۱۳۲۴ء	۳۵ ب
٧٩ -	شمس تبریز	۶۳۸ھ/۱۲۴۱ء	"
٨٠ -	مولانا روم	۶۷۲ھ/۱۲۷۳ء	۳۶
٨١ -	ابن عربی	۶۳۷ھ/۱۲۳۹ء	۳۶ ب
٨٢ -	نجیب اللہ ستور	۶۱۲ھ/۱۲۱۳ء	۳۷
٨٣ -	برہان الدین	۶۳۵ھ/۱۲۳۷ء	"
٨٤ -	فخرالدین حموی	۶۸۸ھ/۱۲۸۹ء	"
٨٥ -	سعدالدین حموی	۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء	۳۷ ب
٨٦ -	ناصرالدین بیضاوی	۶۹۱ھ/۱۲۹۲ء	"
٨٧ -	قطب الدین	۷۱۰ھ/۱۳۱۰ء	۳۸
٨٨ -	میر سادات حسینی	۷۱۸ھ/۱۳۱۸ء	۳۸ ب
٨٩ -	شاہ صفی اللہ	۷۳۶ھ/۱۳۳۵ء	۳۹

---

(۱) فہرست میں شبحان ہے، اور مطبوعہ نسخہ میں صبحان ہے، مگر در اصل وہ شاہ سنجان ہیں۔ وہ بزرگان مشایخ میں ہیں، ان کا پورا نام خواجہ رکن الدین محمود خوافی سنجانی ملقب بہ شاہ سنجان ہے۔ خواجہ مودود چشتی کے مرید تھے۔ وفات ۵۹۳، ۵۹۷ یا ۵۹۹ میں ہوئی۔ (دیکھئے لغت نامۂ)

نمبر	نام	سنہ وفات	ورق
۹۰ -	علاءالدولہ سمنانی	۷۳۶ھ/۱۳۳۶ء	"
۹۱ -	حافظ شیرازی	۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء	۲۹ ب
۹۲ -	اوحدالدین اصفہانی	۷۳۸ھ/۱۳۳۷ء	۲۹ ب
۹۳ -	ابن یمین	۷۶۹ھ/۱۳۶۸ء	"
۹۴ -	امام یافعی	۷۶۵ھ/۱۳۶۴ء	۳۰
۹۵ -	شاہ نعمت اللہ ولی	۸۳۴ھ/۱۴۳۱ء	۳۰ ب
۹۶ -	سید علی ہمدانی	۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء	"
۹۷ -	شاہ نصیرالدین چراغ دہلی	۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء	"
۹۸ -	سید محمد حسینی گیسودراز	۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء	۳۱ ب
۹۹ -	شیخ مخدوم جہانیاں	۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء	۳۱ ب
۱۰۰ -	قاسم انوار	۸۳۸ھ/۱۴۳۵ء	۳۲
۱۰۱ -	کمال خجندی	۸۰۰ھ/۱۳۹۸ء	"
۱۰۲ -	امیر تیمور	۸۰۷ھ/۱۴۰۵ء	۱۲ ب
۱۰۳ -	سعدالدین تفتازانی	۷۹۲ھ/۱۳۹۰ء	"
۱۰۴ -	میر سید شریف	۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء	۳۳
۱۰۵ -	شیخ مغربی	۸۱۹ھ/۱۴۱۳ء	"
۱۰۶ -	بدیع الدین قطب مدار	۸۳۶ھ/۱۴۳۳ء	۳۳ ب ۸۴۰ م
۱۰۷ -	سعدالدین کاشغری	۸۵۸ھ/۱۴۵۴ء	۳۴
۱۰۸ -	شیخ عبیداللہ احرار	۸۸۹ھ/۱۴۸۴ء	۳۴ ب
۱۰۹ -	مولانا جامی	۸۹۸ھ/۱۴۹۳ء	۳۴ ب
۱۱۰ -	حسین واعظ کاشفی	۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء	۳۵
۱۱۱ -	حسین شاہ غازی	۹۱۱ھ/۱۵۰۵ء	"
۱۱۲ -	جمالی دہلوی	۹۴۲ھ/۱۵۳۶ء	"
۱۱۳ -	علاءالدین مجذوب (اکبرآبادی)	۹۵۳ھ/۱۵۴۶ء	"
۱۱۴ -	رفیع[1] الدین صفوی	۹۵۵ھ/۱۵۴۸	۳۶ ب
۱۱۵ -	محمد غوث گوالیاری	۹۷۰ھ/۱۵۶۳	"

---

(۱) فہرست سالار جنگ ۵: ۱۵۴ میں ان کا نام رضی الدین غلط درج ہے، رفیع الدین صفوی صحیح ہے، خزینۃ الاصفیا، ج ۲، ص ۳۳۱ ملاحظہ ہو (بقیہ اگلے صفحہ پر)

۱۱۶ -	شاہ عالم احمدآبادی	۸۸۰ھ / ۱۴۷۵	"
۱۱۷ -	احمد مغربی (احمدآباد)	۸۹۳ھ / ۱۴۸۸	۴۷
۱۱۸ -	سید علی گجراتی	۹۲۰ھ / ۱۵۱۴	۴۷ ب (مطبوعہ ۹۷۴
۱۱۹ -	سید علی متقی گجراتی	۹۷۵ھ / ۱۵۶۷	" رک خزینہ ۱: ۴۳۱
۱۲ -	شاہ عبد الغفور عرف شاہ لہور (گوالیاری)	۹۸۵ھ / ۱۵۷۷	۴۸
۱۲۱ -	شیخ سلیم چشتی	۹۷۹ھ / ۱۵۷۱	۴۸ ب
۱۲۲ -	شیخ جلال الدین تھانیسری	۹۸۹ھ / ۱۵۸۱	۴۹ رک خزینہ ۱: ۴۴۰
۱۲۳ -	شیخ وجیہ الدین	۹۹۸ھ / ۱۵۹۰	۴۹ ب
۱۲۴ -	شیخ فتح اللہ حسینی	۱۰۲۸ھ / ۱۶۱۹	۵۰ ب جد مادری مولف
۱۲۵ -	شیخ بہاء الدین عاملی	۱۰۳۰ھ / ۱۶۲۱	۵۱
۱۲۶ -	سید نور اللہ شوشتری	۱۰۱۹ھ / ۱۶۱۰	"
۱۲۷ -	شیخ احمد کابلی سرہندی فاروقی	۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۶	۵۲
۱۲۸ -	شاہ مہر	۱۰۴۵ھ / ۱۶۳۵	۵۲ ب
۱۲۹ -	بہاء الدین نقشبند	۸۵۷ھ / ۱۴۵۳	۵۳
۱۳۰ -	پیرا مہرلھی	۱۰۴۲ھ / ۱۶۳۳	۵۳ ب

(بقیہ پچھلے صفحہ سے)
یہ قطعہ ہے۔

مظہر خالق[1] زمان و زمیں	شاہ[2] دنیا و دین رفیع الدین،
سال فوتش[3] چو چون گہر سفتم	صاحب رفعت[4] جنان گفتم
در حویلی[5] آصف جاہی	مرقدش رابجو اگر خواہی
آن حویلی بہ اکبرآباد است	نہ بجای دگر مرا یاد است

خزینۃ الاصفیا سے معلوم ہوا کہ میر معین الدین صاحب تفسیر معینی ان کے دادا تھے، وہ شاگرد دوانی تھے۔

(۱) خزینۃ الاصفیا میں مظہر کا حوالہ ہے (ج ۲، ص ۳۴۵)

نمبر	نام	تاریخ	حوالہ
۱۳۱ -	عبدالقادر[1] بخاری اکبرآبادی	۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰	″
۱۳۲ -	شیخ عبدالحق محدث دہلوی	۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲	″
۱۳۳ -	شیخ[2] ناظر اکبرآبادی	۱۰۵۷ھ/۱۶۴۷	۲۵۳
۱۳۴ -	ولی محمد نارنولی	۱۰۵۷ھ/۱۶۴۷	۲۵۵
۱۳۵ -	شیخ محب اللہ الٰہ آبادی[3]	۱۰۶۰ھ/۱۶۵۰	″
۱۳۶ -	میر نعمان اکبرآبادی	۱۰۶۰ھ/۱۶۵۰	۳۶

(بحوالہ مخبر درخزینۃ الاصفیا ج ۱ ص ۶۳۶، ۱۰۵۸ و ۱۰۶۰ ہجری)

نمبر	نام	تاریخ	حوالہ
۱۳۷ -	میرصالح کشفی	۱۰۶۰ھ/۱۶۵۰	″
۱۳۸ -	امیر ابوالعلا	۱۰۶۱ھ[4]/۱۶۵۱	۲۵۶
۱۳۹ -	سید احمد بدر مرتب	۱۰۶۲ھ/۱۶۵۲	۶۱
۱۴۰ -	سید احمد بخاری	۱۰۶۳ھ/۱۶۵۳	″
۱۴۱ -	حسن بن نصیر اللہ	۱۰۶۳ھ/۱۶۵۳	″
۱۴۲ -	شیخ فیروز	۱۰۶۵ھ/۱۶۵۵	۲۶۱
۱۴۳ -	شیخ مجتبیٰ[5]	۱۰۶۳ھ/۱۶۵۳	″
۱۴۴ -	سید بالی[6]	۱۰۶۵ھ/۱۶۵۵	۶۲
۱۴۵ -	جمال[7] چشتی	۱۰۶۶ھ/۱۶۵۶	″

---

(۱) خزینۃ الاصفیا ۱ : ۱۶۳ پر سید عبدالقادر کی تاریخ وفات ۱۰۵۰ھ اور مزار اکبرآباد میں بتایا گیا ہے۔

(۲) دیکھیے خزینۃ الاصفیا، ج ۲، ص ۳۳۹ جس میں شیخ ناظر کے واقعات بحوالۂ مخبر الواصلین درج ہیں۔

(۳) خزینۃ الاصفیا، ج ۲، ص ۳۳۹ بحوالہ مخبر

(۴) بحوالہ مخبر ۱۰۶۱ خزینۃ الاصفیا ۱: ۶۳۶ مطبوعہ میں بھی ہے مگر سالار جنگ میں ۱۰۶۹ ہے۔

(۵) شیخ بالی اکبرآبادی

(۶) بحوالہ مخبر (خزینۃ ۲ : ۳۵)

(۷) خزینۃ ۳۵۰ بحوالہ مخبر

(۸) بحوالہ مخبر ۱ : ۲۵۵

۱۳۶ - محمد صالح سنکری ۱۰۶۵ھ/۱۶۵۴ء ۶۲

"مخبرالواصلین" کی اہمیت اس لحاظ سے ہے کہ اس کی پہلی روایت میں ۱۳۶ سے زیادہ شخصیات جو حضور اکرم سے شروع ہوکر مصنف کے دور کے بعض افراد پر (سالار جنگ کے اعتبار سے شیخ محمد صالح اکبرآبادی پر) ختم ہوتی ہے، اور دوسری روایت میں ۸۱ افراد کا اضافہ ہے قدما کے واقعات و تاریخ ہائے وفات کے لیے گیارھویں بارھویں صدی کے مصنف کے بیان کی چنداں اہمیت نہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ ان سب حضرات کے بارے میں ایک نظر میں کچھہ کام کی چیزیں خصوصاً تاریخ ہائے وفات معلوم ہو سکتی ہیں۔ اس کتاب کی اہمیت معاصرین کے ترجمے کی وجہ سے ہے جن میں بعض ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن کے بارے میں صرف یہی کتاب ماخذ کا کام دیتی ہوگی اور اس کتاب کا مطالعہ اس لحاظ سے بہت سود مند ہے۔

ذیل میں مخبرالواصلین کے کچھہ اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

۱- پروفیسر شفیع نے لکھا ہے (مقالات، ج ۵، ص ۳۱) کہ مصنف مخبرالواصلین محمد صالح سنکری اکبرآبادی عارف ربانی شاہ جیلانی کے مریدوں میں سے تھا، حاشیہ میں لکھا کہ محمد صالح کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو "خزینۃ الاصفیا"، اس آخرالذکر کتاب، ج ۱، ص ۱۷۱-۱۷۲ پر محمد صالح اکبرآبادی کے حالات مختصراً درج ہیں، پھر لکھا ہے کہ وفات وی بقول صاحب مخبرالواصلین بتاریخ سیزدھم ماہ ذی قعدہ جمعہ سال یک ہزار و شصت و ہفت ہجری است و مزار پر انوار در اکبرآباد است، خزینۃ الاصفیا، ص ۱۷۱ میں مخبرالوصلین کا یہ قطعہ درج ہے:

ماہ ذی قعدہ بود سیزدھم — رفت صالح باوج چرخ لہم
سال ہنقارش ازدل مسعود — شاہ باز مقام عرش کشود
عقل تاریخ نقل آن مسعود — زد رقم اہل فیض صالح بود (۱۰۶۷)

اس سے ظاہر ہے کہ محمد صالح اکبرآبادی کی تاریخ وفات ۱۰۶۷ مخبرالوصلین میں موجود ہے، لیکن مطبوعہ نسخہ (ص ۹۸ بعد) میں محمد صالح کی نسبت سنکری یا سنگری مفقود ہے۔

تاریخ[۱] وفات حضرت رسول مقبول علیه الصلوة و السلام از مظهر الحق اکبرآبادی صاحب مخبر[۲] واصلین :

چون شفیع الوراء بحکم خدا	شد ز دار فنا به قصر بقا
عمر آن شاه قبلهٔ آمال	ابن عباس گفت شصت و سه سال
روز مولود و نقل آن محمود	گفت شاه نجف دوشنبه بود
سال ترحیل آن شفیع امم	از ربیع نخست دوازدهم
سال نقلش خرد به تعمیه خواند	از بهد زمانه خالی ماند
شد رقم سال نقل آن عالی	حیف بی احمد امت دین خالی
باز تاریخ نقل او دریاب	زندگی رفت بیشک از اصحاب
سال نقلش زعقل ثابت گشت	روح اکبر ز اهل بیت گذشت
سال نقلش بخوان به ناله و آه	گز مدینه بشد نبی الله
باز تاریخ نقل او برخوان	سکه شد از فراق او بی جان
چون شفیع الورا ز دنیا شد	گفت هاتف که دُرز دریا شد
نتوان گفت دُر ز دریا شد	بلکه گویم که جان ز دنیا شد
صد هزاران درود نامعدود	باد بر ذات پاک آن محمود

تاریخ وفات صدیق اکبر از مخبر الواصلین (ص ۹ ح) ؛ مخبر الواصلین مطبوعه ص ۲۳ .

آنکه او صادق الورا بوده	یار پیغمبر خدا بوده
عمر آن شاه صادق الاحوال	هست بی اشتباه شصت و سه سال
بر سریر خلافت از تقدیر	پنج ماه و دو سال ماند امیر
آنکه تاریخ او چو گوهر سفت	روز فوتش چهار شنبه گفت
بست و دوم جمادی الاخری بود	که بدارالبقاش نقل نمود
عقل سال وصال او فرمود	درس جود رفت صاحب جود
قبر او جنب قبر پیغمبر	همقران است همچو شمس و قمر

(۱) خزینة الاصفیاء ج ۲، ص ۹ حاشیه ؛ مخبر نسخهٔ مطبوعه، ص ۲۲ ؛ مطبور اکرم اور خلفائے راشدین کی تاریخ وفات سے قبل شاعر نے حمد، نعت، منقبت خلفائے راشدین اور شاهجهان بادشاہ کی مدح میں اشعار الگ الگ عنوان سے لکھے ہیں (ص ۱۴—۲۱)

تاریخ وفات حضرت خلیفهٔ ثانی از مخبرالواصلین (ص ۱۳ ح) مخبرالواصلین مطبوعه ص ۲۳ :

عمر آن پادشاه کشور دین چون ز دنیا شده بخلد برین
همچو صدیق صادق‌الاحوال عمر او نیز بود شصت و سه سال
کرد شاهی بدولت و اقبال بست و نه روز شش برو ده سال
شنبه و غرهٔ محرم بود که عمر نقل از جهان فرمود
بس که در عدل سعی و کدش بود در سنه گد[1] رحلتش فرمود
سال نقلش خرد بحیرت خواند وای صد وای عدل[2] یکس ماند
مرقد او قریب صدیق است این بگفتم بدان که تحقیق است

تاریخ وفات حضرت عثمان از مخبرالواصلین (ص ۱۵ ح) مخبرالواصلین مطبوعه، ص ۲۳

آنکه او صاحب حیا بوده حامی[3] دین مصطفی[1] بوده
عمر آن خسرو عدالت و داد هم نود گفته اند هم هشتاد
ده و دو سال بر خلافت ماند خلق را در ره شریعت خواند
سوی فردوس چونکه عزم نمود جمعه و هژدهم ز ذی‌حج بود
چونکه او دال خیر و احسان بود در سنه دال رحلتش فرمود
سال نقلش بگو بدرد و الم که وفا و حیا شد از عالم
در جوار بقیعهٔ والا مرقد اوست ای خجسته لقا

تاریخ وفات حضرت شاه ولایت از مخبرالواصلین (ص ۲۵ ح ۱)، مخبرالواصلین مطبوعه، ص ۲۳ .

آنکه زوج بتول حق بوده ابن عم رسول حق بوده
شاه تخت ولایت است علی ماه چرخ هدایت است علی
شش سه و چار سال کرد روان حکم امر خلافت آن سلطان
روز جمعه بوقت صبح نمود ماه ما سوی اوج خلد نمود

---

(۱) گد=۲۳
(۲) عدل=۱۰۴، اس میں سے کس کے (۸۰) اعداد گھٹانے سے سنہ ۲۳ حاصل ہوتا ہے۔

بود ماه صیام نوزدهم که شد آن پادشاه بچرخ نهم
گر تو سال شهادتش جوئی سر[۱] ماتم چرا نمی گوئی
باز سال شهادتش که جلی است یکسان آخر دو حرف[۲] علی است
شد رقم سال قتل آن اعظم رفت صد حیف صاحب از عالم
سال قتلش دگر به تعمیه خوان وای صد وای زیب شد زجهان
سال قتلش بهم منادی شد که ز دوران علی" عالی شد
عمر آن شاه واقف الاحوال همچو عمر نبی است شصت وسه سال
در نجف مرقد منور اوست آسمان و زمین معطر ازوست

از مخبر الواصلین (ص ۲۷ ح)، مخبر الواصلین مطبوعه، ص ۲۵

حسن آن بادشاه کون و مکان کنیت او ابو محمد دان
بعد حیدر خلافت آن شاه پنج ماه وسه روز با شش ماه
دل ز دنیای بی وفا برداشت امرو نهی خلافتش برداشت
ختم بوذات او خلافت شد بعد ازان فتنها و آفت شد
عقل سال ولادت آن شاه یافت حرف نخست بسم[۳] الله
لیک از روی اختلاف بگو سر[۴] جان است سال زادن او
بود تاریخ هفتم ای مسعود صفرش در مه صفر فرمود
صبح یوم الخمیس نقل نمود زین جهان سوی حضرت معبود
انتهای تمام بسم الله این دو حرفست سال رحلت شاه
هاتفم گفت سال نقل امام حیف آفاق ماند بی اسلام
در بقیعه مزار او آمد رحمت حق نثار او آمد

از مخبر الواصلین (ص ۳۰ ح)، مخبر الواصلین مطبوعه، ص ۲۶

سید متقی شه کونین یکسان آمده امام حسین
قرة العین مصطفیٰ وبتول گلشن روضهٔ فروع و اصول

---

(۱) سر ماتم یعنی م=۴۰
(۲) دو حروف علی ل ی=۴۰
(۳) یعنی ب=۲
(۴) یعنی ج=۳

گر بحرف نخست بسم الله   سر الحمد را کنی همراه
سال مولود[1] آن شهنشه دین   می بر آید از آن دو حرف ببین
سخن مختلف ز عام اینست   سال مولود او سر[2] دین است
جمعه و عاشر محرم بود   که ز عالم امام نقل نمود
سورهٔ فاتحه تمام بخوان   بعد ازآن هر دو حرف مقطع آن
بیشک وریب بنگری[4] دو گواه   بهر سال شهادت آن شاه
سال نقلش بگو ره محنت و غم   که برون شد امام از عالم
سال نقلش بگفت غمگینی   سر دین[3] را برید بی دینی
مرقد او بکربلا آمد   هر دو عالم برو فدا آمد

از مخبر الواصلین (ص ۴۹ ح) ، (مخبر الواصلین مطبوعه ، ص ۳۵-۳۶)

آنکه او بود مجتهد بزمان   نام او بو حنیفهٔ نعمان
ذات او رهنمای عالم بود   از همه اعلم و معظم بود
سال مولود آن شه والا   جلوه گر گشت از سر فقها ف= .
گر ازین هم ترا نشان نبود   سال تولید او عیان نشود
پس بیا سهدی° بدادش خوان   یا مگر طبیت جهانش دان
روز شنقار او سه شنبه دان   بود تاریخ چارم شعبان
لیک از روی اختلاف اسم   از رجب ماه بود چاردهم
نقل تاریخ او چه گوهر سفت   سال ترحیل او سعلی[5] گفت
مرقدش دان بخطهٔ بغداد   تن زجانش برحمت حق شاد

از مخبر الواصلین (ص ۵۲ ح) ؛ مخبر مطبوعه ، ص ۳۶

بهر علم و فضل و صدق و یقین   شافعی بود فخر مجتهدین
لمعت مادرش رسد بحسن   ذات او بود زین سبب احسن

---

(۱) ب+۱=۳
(۲) سر دین=د=۴
(۳) سر دین=د ، ین=۱۰+۵۰=۶۰
(۵) سعلی=۱۵۰

چونکہ هاشمی و مطلبی است   هم قریشی و مکی و عربی است
روز آدینه بود سلخ رجب   که شده شاهی بحضرت رب
سال مولود او معلیٰ دان   سال ترحیل وی مقدس خوان
مرقد او بمصر فیض رسان   به زمین و زمان و کون و مکان ۹۰۲ھ

مخبرالواصلین (ج ۱ ص ۱۷۳ ح)، مخبر[۱] مطبوعہ، ص ۱۱۳)

مقتدای زمانه ملا شاه   نور الله قبره وهراه
رهنمای صدیقان بوده   پیشوای محققان بوده
سال تاریخ آن خدا آگه   گفت محبوب خلد ملا شاه

مخبرالواصلین (ایضاً)، (مخبر مطبوعہ، ص ۱۱۴)

آنکه شاه بلند اقبال است   رتبه‌اش در مقام ابدال است
شاه دارا شکوه نامش بود   به مقام ولی مقامش بود
شد چو زین دامگاه حزن و ملال   شد بفردوس با دل خوش حال
جمعه و غرهٔ مه عاشور   بود تاریخ وصل آن مغفور
سال تاریخ نقل آن شه دین   شد رقم صاحب بهشت برین
مرقد آن قتیل عشق الله   هست در گنبد همایون شاه ۱۰۷۰ھ

از مخبرالواصلین (ج ۱ ص ۲۴۲ ح)، (مخبر مطبوعہ، ص ۶۲)

خسرو دهلوی بحکم خدا   به شب جمعه شد ز دارفنا
عمر هفتاد و پنج سالش بود   کانزمان شد بحضرت معبود
هژدهم بود از مه شوال   که گذشت او ازین جهان ملال
خسرو دهلوی بهشتی بود   سال نقلش بگو که چشتی بود
سال ترحیل افصح الشعرا   گفت هاتف بهشتیٔ ابدا
سال نقلش خرد عیان و نهفت   باز شکر مقال طوطی گفت

---

(۱) ملا شاہ اور دارا شکوہ کی تاریخیں سالار جنگ کے نسخہ میں نہیں، مطبوعہ نسخے میں ہے۔ اس سے واضح ہے کہ خزینۃ الاصفیا میں مطبوعہ نسخے سے استفادہ ہوا ہے۔

از مخبرالواصلین (۲ : ۲۷۸ ح)۰ (مخبر مطبوعه : ص ۵۸)

آنکه مولانای روم نامش بود دل فروز جهان کلامش بود
قطب سپهر علیاش نور کون و مکان جلال‌الدین
از ربیع نخست بود ششم که طلوعش نمود چون انجم
سال مولود آن خدا آگه شد رقم آفتاب عالی جاه
شده تاریخ نقل آن پنجم بیشک و ریب آن جماد دوم
سال نقلش بخوان بعد تعظیم آمده آفتاب اوج نعیم
سال نقلش زاوج هفت طبق عالمم گفت قطب جنت حق
سال نقلش به اشتهار زمان نور الله مرقده برخوان (۶۶۲ھ)

و صاحب مخبرالواصلین تاریخ وفات حضرت خواجه حافظ بسال هفتصد و نود ویک تحریر فرموده است (متن خزینة الاصفیا، ج ۲ ص ۳۰۲): ص ۳۰۲ حاشیه :

از مخبرالواصلین : (مخبر مطبوعه ص ٦٦)

افصح بی نظیر شمس‌الدین طوطیٔ سبزه زار خلد برین
بود عجب اللسان بحکم خدا « نور الله صدره » ابدا
گفت تاریخ نقل آن عارف طوطیٔ خلد بی گمان هاتف
به محل، است مرقد پاکش سرمهٔ چشم عرشیان خاکش ۷۹۱ھ

صاحب مخبرالواصلین سال ولادت وی (بدیع‌الدین مدار) سال هفتصد و شانزده و وفات بتاریخ هژدهم جمادی الاول بروز جمعه سال هشتصد و چهل تحریر فرموده و عمر وی یکصد و بیست و چهار سال ارقام می فرماید (متن ص ۳۱۳)[1]

آنکه قطب مدار عالم بود شاه ذی جاه مثل او کم بود
همه سال طلوع آن یافتن شمس دنیا و دین بدیع‌الدین
به شب جمعه شاه نقل نمود هژدهم از جمادی اولی بود
سال ترحیل آن عیان و نهفت عقل قطب المدار جنت گفت
در مکن پور هست مرقد او هند را شد هزار فخر ازو

(۱) دیکھیے مخبرالواصلین مطبوعه، ص ۴۰-۴۱

مطبوعہ نسخے کے اضافہ شدہ حصے کی بعض تاریخیں ذیل میں درج کی جارہی ہیں: تاریخ رحلت شاہ جہاں ص ۱۱۹-۱۲۰

خرد تاریخ نقلش چون گہر سفت جمال خلد باد، شاہ جہان گفت ص ۱۱۹

از رجب بود بست و ششم — کہ ز شاهی شدہ بچرخ نہم
سال تاریخ رحلتش رضوان — زد رقم عز خلد شاہ جہان
گفتم ای دوست خاصۂ فردوس — سال نقلش خلاصۂ فردوس
سال نقلش سلک عیان و نہفت — پادشاہ ولی بہشتی گفت
سال تاریخ نقل شاہ جہان — رضی اللہ زد رقم رضوان
روضۂ او بہ اکبرآباد است — همچو فردوس عرش بنیاد است

(۱۰۷۶ ص ۱۲۰)

سلسلۂ قادریہ کا شجرہ (ص ۱۱۶-۱۱۹)

نظم این سلسلہ بہ لطف قدیر — شد در ایام شاہ عالمگیر
یارب این پادشاہ عادل را — متقی و شجاع و باذل را
از حسودی دشمن بدکیش — تو نگہدار در حمایت خویش
نام آن شجرۂ قلوب مدان — کہ همین است سال مختتم آن

(۱۰۷۲ ھ) ص ۱۱۹

تاریخ وفات حضرت میر فیض اللہ بن میر ابوالعلا (ص ۱۲۳)

آنکہ او مظہر صفا بودہ — خلف میر ابوالعلا بودہ
قطب آفاق میر فیض اللہ — جعل اللہ فی الجنان مثواہ
سلخ ذیقعدہ بود و آدینہ — کہ گذشت آن عزیز دیرینہ
سال ترحیل او سروش الہ — گفت زیب جہان ز فیض اللہ (۱۰۸۱)

تاریخ وفات شیخ محمد معصوم[1] سرہندی

قطب دین شیخ محمد معصوم — عزم چون سوی جنان فرمودہ (۱۰۷۹)
سال نقلش خرد مظہر حق — زد رقم قطب مشایخ بودہ (ص ۱۲۲)

---

(۱) ان کی وفات کی دو اور تاریخیں درج ہیں۔

تاریخ وفات شیخ پیر محمد لکھنوی (ص ۱۲۵)

شیخ پیر محمد از دنیا   شد چو مہر منیر سوی سما
مسکن او به لکھنؤ بوده   اندرین شہر نقل فرموده
اندرین آیت کلام خدا   سال نقلش بخوان بصدق وصفا

لا خوف علیہم و لا ہم یحزنون

تاریخ وفات شاہزاده سلطان محمد (ص ۱۲۶)

حسرتا دردا و واویلا که از چشم جہان
در زمین گنج ور سلطان محمد شد نہان
صد ہزار افسوس و اندوه و غم و درد است و آه
شاه عالمگیر را از سوز فرزند کلان
خاک بادا بر سر این روزگار بیوفا
چاک بادا سینهٔ این گیتیِ نا مہربان
در دوشنبه ہشتم شوال سال نقل او
شد رقم سلطان محمد صاحب خلد و جنان

تاریخ وفات میر محمد عاقل بن میرا محمد صالح (ص ۱۲۶)

زہی مقتدای جہان میر عاقل   که موصوف بوده به نیکو خصایل
به اکرام و احسان و خلق و مروت   ز لطف جہان آفرین بود کامل
زماه رجب بود تاریخ ہفتم   که کرده بفردوس و الاش منزل
خرد گفت سال وصالش به مظہر   بجنت بود مسکن میر عاقل ۱۰۸۸

تاریخ وفات میر مومن[۲] خوش نویش المتخلص بعرشی (ص ۱۳۰)

---

(۱) بہت ممکن ہے اس سے مراد میر صالح کشفی پسر میر عبداللہ مشکین قلم ہوں ۔

(۲) میر مومن عرشی میر صالح کشفی کے چھوٹے بھائی تھے، صاحب دیوان شاعر ہیں، ان کے کلیات کے نسخے کلکتہ، پٹنہ میں اور دیوان کا نسخہ سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد میں ہے ۔

زهی مقتدای زمان میر مومن | بخوبی گذشت از جہان میر مومن
بدین و به اسلام و ایمان و عرفان | بحق کرد تسلیم جان میر مومن
به ماهی که رفت از جہان سرور دین | گذشته ازین خاکدان میر مومن
شب پنجشنبه بتاریخ زبده | روان شد بقصر جنان میر مومن
چو پرسید سال وفاتش محبان | بگو سید عرشیان میر مومن ۱۰۹۱

میر مومن سید عرفان پناه | چون ز دنیا رفت سوی خلد آه
سال نقلش از زبان عرشیان | گو ولی از دور عالم رفت آه ۱۰۹۱ ھ

تاریخ وفات عرفان پناه شیخ عبداللہ پیر شاہ عالم (ص ۱۳۱)

شیخ عبداللہ والا جاہ عرفان دستگاہ | بود بیشک حق شناس و حق پرست و حق نما
اختر برج شریعت بود از اوج شرف | گوهر بحر حقیقت بود با قلب صفا
بیستم بود ازمه عاشور روز نقل او | شد دوشنبه بر طریق سید خیر الوری
شد رقم سال وصال آن حقایق دستگاہ | بود عبداللہ بیشک متقی از اولیا ۱۰۹۲ ھ

شیخ عبد اللہ عرفان دستگاہ | جانب جنت بعزو جاہ شد
درمه عاشور سال نقل او | گو به اوج خلد عبداللہ شد

تاریخ وفات برادر حقیقی ام سید محمد عاقل رحمۃ اللہ علیه (ص ۱۳۲)

زهی سید عالی نیکنام | چو شد زینجہان سوی دار السلام
جہان بر من خستہ دل تنگ شد | گل زعفران زعفران رنگ شد
سر شکم چو طوفان بلاخیز شد | دلم از غمش نعره انگیز شد
مرا از غم ماتمش سینه چاک | من از اشک در آب، او زیر خاک
وجود لطیفش بخاک آمده | زمین از غمش سینه چاک آمده
مه آسمان شد بزیر زمین | به اعداد مه[1] سال عمرش ببین
وجودش بخاک ازوه اعتبار | چو مصحف نہان شد بخط غبار

---

(۱) یعنی ۵۰، یس اس کی تاریخ ولادت ۱۰۴۵ ھ ہوئی (۱۰۹۵-۴۵)

تنش زیر خاک آمده زان صفات	بظلمات پنهان چو آب حیات
وجودش تن خاک راجان شده	بگنجی که درخاک پنهان شده
در آینه از لطف حیٰ قدیر	بخاکش نهان شد چو بو در عبیر
مرا از غم آن برادر ببین	شب و روز بادرد و غم همنشین
بحرمان آن سید نیک نام	به ویلا و آه و فغانم مدام
دهم از جمادی دوم نقل کرد	ازین منزل آن رهرو نیک مرد
دلا سال نقلش بلطف کریم	بگو جای عاقل بهشت نعیم

زهی سید که نامش بود عاقل	گل رحمت نثار جسم و جانش
چو تاریخ و صالش جستم ازدل	خرد گفتا بخلد آمد مکانش ۱۰۹۲

تاریخ وفات نواب شایسته خان (ص ۱۳۹)

مصدر فیض و کرم شایسته خان	گوی نیکوئی ازین آفاق برد
سال نقل آن امیر با کرم	گفت هاتف اهل خیر و داد مرد

چوشد شایسته خان زین دهر دلکش
'بجان غم داد' شد تاریخ فوتش

بود نواب امیرالامرا	عمدة الملک شهنشاه زمان
خان شایسته ابوطالب نام	قرۂ باصرۂ آصف خان
سال نقلش بتاسف گفتم	آه نواب سخی شد زجهان

بود شایسته خان ابو طالب	بیگمان صاحب سخاوت وجود
گفت میر بهشت حق آمد	عقل، سال و صال آن محمود

آخر میں چند اہم بات کے ذکر پر یہ مقالہ ختم کیا جاتا ہے:

یہ مقالہ اول اول سالار جنگ میوزیم کے نسخے کی روشنی میں لکھا گیا تھا، پھر مطبوعہ نسخے کی مدد سے اس مقالے پر تجدید نظر ہوئی۔ سالارجنگ کے نسخے میں ۶۵ ورق اور کل ۴۸

اشخاص کی تاریخ وفات اور بعض کی تاریخ ولادت بھی درج ہو گئی ہے، مطبوعہ نسخہ میں تقریباً ۸۱ افراد کا اضافہ ہے اور یہ سارے افراد مولف کے معاصر ہیں۔ اس لیے یہ آخری حصہ تاریخی لحاظ سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور اسی کے پیش نظر اس حصے کے افراد کی فہرست درج کی جاتی ہے:

۱ - مولوی عبد الحکیم سیالکوٹی	۱۰۶۷	ص ۱۱۲ - ۱۱۳
۲ - ملا شاہ مرشد داراشکوہ	۱۰۶۹	ص ۱۱۳
۳ - حکیم سرمد	۱۰۷۰	"
۴ - شیخ عبدالحی	۱۰۷۰	ص ۱۱۳-۱۱۴
۵ - سلطان داراشکوہ	۱۰۷۰	ص ۱۱۴
۶ - حضرت وجیہ الدین	۱۰۷۱	ص ۱۱۴ - ۱۱۵
۷ - شیخ شہاب الدین	۱۰۷۱	ص ۱۱۵
۸ - شیخ جعفر[۱]	۱۰۷۴	"
۹ - سلسلہ قادریہ و تاریخ نظم	۱۰۷۲	ص ۱۱۹
۱۰ - شاہ حیدر	۱۰۷۶	"
۱۱ - شاہ جہاں	۱۰۷۶	ص ۱۱۹-۱۲۰
۱۲ - شیخ پیر	۱۰۷۷	ص ۱۲۰
۱۳ - شیخ جمال محدث	۱۰۷۸	ص ۱۲۱
۱۴ - شیخ اللہ قادری	۱۰۷۸	"
۱۵ - ابو النصر، نصر بدخشی	۱۰۷۸	"
۱۶ - شیخ معصوم	۱۰۷۹	ص ۱۲۲
۱۷ - شیخ زاہد	۱۰۸۰	ص ۱۲۲
۱۸ - شیخ نعمت اللہ نارنولی	۱۰۸۰	ص ۱۲۳
۱۹ - میر فیض اللہ بن میر ابوالعلا	۱۰۸۰	"
۲۰ - قاسم خاں	۱۰۸۳	"
۲۱ - حضرت شیخ برہان شطاری	۱۰۸۳	ص ۱۲۴
۲۲ - شیخ ولی محمد بن اسرائیل	۱۰۸۴	"
۲۳ - حسن بیگ صوفی	۱۰۸۳	ص ۱۲۵

---

(۱) شیخ صالح مرشد مولف کتاب کے بھائی تھے۔

٢٤ - شاه دوله	١٠٨٥	"
٢٥ - شیخ پیر محمد لکهنوی	١٠٨٥	"
٢٦ - خلیفه محمد یوسف	١٠٨٦	"
٢٧ - شاه رفیع سبزپوش	١٠٨٦	ص ١٢٦
٢٨ - شاهزاده سلطان محمد	١٠٨٧	"
٢٩ - مرزا حکیم ابو المظفر	١٠٨٨	"
٣٠ - میر محمد عاقل بن میر محمد صالح	١٠٨٨	ص ١٢٧
٣١ - شیخ عبد الرشید	١٠٨	"
٣٢ - مریم ثانی	١٨٠	"
٣٣ - بی‌بی صاحبه مخدومه	١٠٨	"
٣٤ - بی‌بی عقیله	١٠٨٥	"
٣٥ - شیخ طنه	١٠٨٥	ص ١٢٨
٣٦ - قاضی قربان	١٠٨٥	"
٣٧ - قاضی معین الدین محتسب	١٠٨٥	"
٣٨ - خلیفه ابو القاسم	١٠٢٩	"
٣٩ - لطف الله شهید	١٠٩٠	ص ١٢٨ - ١٢٩
٤٠ - شیخ جلال متورع	١٠٨٩	"
٤١ - شیخ عبد العزیز	١٠٨٩	"
٤٢ - قمرالدین حسن معصوم	١٠٩٠	"
٤٣ - شیخ نورالدین	١٠٩٠	"
٤٤ - شیخ حفیظ الله	١٠٩٠	ص ١٣٠
٤٥ - میر مومن عرشی	١٠٩١	"
٤٦ - ملا سلمیٰ هندی	١٠٩١	"
٤٧ - سید عالم	١٠٩٠	ص ١٣١
٤٨ - سید مصطفیٰ	١٠٩١	"
٤٩ - شیخ عبد الله پیر عالمگیر	١٠٩٢	ص ١٣١ - ١٣٢
٥٠ - برادر حقیقی سید محمد عاقل	١٠٩٢	ص ٢٣٢
٥١ - مرزا فریدون بیگ ذاکر	١٠٩٢	ص١٣٣
٥٢ - سلطان حسین	١٠٩٢	"
٥٣ - شیخ قطب عالم	١٠٩٣	"

۵۴ - میر صادق	۱۰۹۳	"
۵۵ - مرزا ابو علی	۱۰۹۳	ص ۱۳۴
۵۶ - مرزا محمد سعید	۱۰۹۴	"
۵۷ - مرزا جعفر	۱۰۹۴	"
۵۸ - شیخ بایزید خویشگی	۱۰۹۴	ص ۱۳۴-۱۳۵
۵۹ - شیخ محمد زمان متوکل	۱۰۹۴	"
۶۰ - مولوی عبداللہ	۱۰۹۴	"
۶۱ - مرزا توختہ بیگ	۱۰۹۴	"
۶۲ - شیخ طالب	۱۰۹۵	"
۶۳ - خواجہ وقار محرم خان	۱۰۹۵	ص ۱۳۶
۶۴ - عفیفہ بیگم	۱۰۹۵	"
۶۵ - ایزدبخش معموری	۱۰۹۵	"
۶۶ - شیخ عبد الرسول	۱۰۹۶	"
۶۷ - باقر اصالت خانی	۱۰۹۶	"
۶۸ - لعل محمد زمیندار	۱۰۹۶	ص ۱۳۶ - ۱۳۷
۶۹ - حاجی دہس	۱۰۹۶	ص ۱۳۷
۷۰ - مرزا فریدون حسین	۱۰۹۶	"
۷۱ - میر افضل احراری	۱۰۹۸	"
۷۲ - میر جان نقشبندی	۱۰۹۹	ص ۱۳۸
۷۳ - پیر محمد سلونی	۱۰۹۹	"
۷۴ - سید حسن	۱۱۰۱	"
۷۵ - دوست محمد	۱۱۰۳	"
۷۶ - عبد اللطیف	۱۱۰۳	"
۷۷ - محمد طاہر	۱۱۰۴	"
۷۸ - میر محمد تقی	۱۱۰۴	"
۷۹ - محمد وصال	۱۱۰۴	"
۸۰ - شایستہ خان	۱۱۰۵	"
۸۱ - میر حسیعلی	۱۱۰۵	ص ۱۴۰

یہ بات عرض کرنی ہے کہ تاریخی قطعات کے اتنے بڑے
مجموعے کم نظر آتے ہیں ۔ سینکڑوں قطعات کا یہ مجموعہ تاریخ گوئی
کی تاریخ کے سلسلے میں کسی قدر اہمیت کا حامل ہے ، لیکن
یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ قطعات سادے ہیں ، اتنے قطعات
میں مشکل سے کوئی قطعہ نظر آئے گا جس میں تعمیہ یا تخرجہ وغیرہ
کی کسی صنعت کا استعمال ہوا ہو ۔ بہر حال گیارویں صدی ہجری
کے نصف دوم پر کام کرنے والے حضرات کے لئے اس کتاب میں کافی
مواد موجود ہے ۔

علم فقہ کا تعارف اور معاشرہ کو اسکی ضرورت

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی *

مقالہ کا موضوع "علم الفقہ کا تعارف اور اس کی معاشرہ کو ضرورت" ہے۔ علم الفقہ بہت طویل الذیل موضوع ہے جسکی وسعت کسی مقالہ کی نہیں بلکہ ضخیم کتاب کی طالب ہے۔ اسلئے یہاں اس موضوع کے صرف ایک گوشے کو پیش کرنا مقصود ہے، جس سے فقیہ کے عمل کی وسعت اور فقہ کی گہرائی و گیرائی نیز اہمیت کا اندازہ کر لینے میں مدد ملے گی، شاید "فقہ کی تعریف" ذکر کرنے کی بات عجیب سی لگ رہی ہوگی! لیکن علمی و اصطلاحی تعریف کا بیان میں آجانا فائدہ سے خالی نہیں۔

"علم فقہ" کی تعریف: ہم یہاں علوم دینیہ کے ایسے شہرۂ آفاق شارح اور امت کے ایسے معتمد فقیہ (نیز متکلم، صوفی اور فلسفی) یعنی امام غزالی کی زبان میں فقہ کی تعریف پیش کرتے ہیں، جنھیں "حجۃ الاسلام" اور "امام" کے لقب سے دنیا یاد کرتی ہے۔ موصوف اپنی مشہور عالم کتاب "المستصفیٰ" ص ۴، ج ۱ (مطبع امیریہ بولاق، مصر ۱۳۲۲ ھ) میں فقہ کی تعریف اسطرح فرماتے ہیں:

الفقه عبارة عن العلم و الفهم فی اصل الوضع (ای فی الفقه) یقال فلان یفقه الخیر و الشر ای یعلمه و یفهمه و لکن صار بعرف العلماء عبارة عن "العلم بالأحکام الشرعیة الثابتة لافعال المکلفین خاصة".

فقہ کے لغوی معنیٰ و سمجھ، اور علم، کے ہیں... لیکن اصطلاحی معنیٰ "انسانوں سے متعلق شرعی احکام جاننا" ہیں۔

---

* مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

اسی بنا پر (جیسا کہ امام موصوف نے بھی لکھا ہے کہ) علم کلام، تفسیر، حدیث، اور فلسفہ وغیرہ علوم کو "فقہ" نہیں کہیں گے حالانکہ یہ بھی علوم ہیں، اور یہ بھی فہم انسانی کی جولانگہ بنی ہیں بلکہ ان میں سے بعض تو (مثلاً حدیث و تفسیر) اشرف ترین علوم ہیں۔ یہ بات پیش نظر رکھنا بھی شاید مفید ہوگا کہ علوم و فنون کی تدوین کے عصر کے بعد فقہ کا دائرہ شریعت کے ان احکام کے اندر محدود سمجھا جانے لگا جنکا تعلق اعمال حسیہ سے ہے۔

امام غزالی کی بیان کردہ تعریف میں، "افعال المکلفین" میں اسی طرف اشارہ ہے۔ اسکا مطلب یہ ہوا کہ عقائد اور کلام جیسے علوم کو اصطلاحی فقہ کے دائرہ سے باہر سمجھنا چاہیے (اگرچہ متقدمین کے یہاں "فقہ" کی تعریف عام تھی) ان کے نزدیک وہ ہے جو کہ امام ابو حنیفہ نے "فقہ" کی تعریف کی ہے "هو معرفة النفس مالها و ما علیها" (تلویح ص ۱۱) یعنی نفس انسانی سے متعلق مفید اور مضر باتوں کا جاننا جسمیں علم عقاید کے (کلامی) مسائل بھی آجاتے تھے، چنانچہ امام ابو حنیفہ کی بیان کردہ مذکورہ تعریف اور انکی طرف منسوب علم کلام کی مشہور کتاب کا نام "فقہ اکبر" ہونا اسکا بین ثبوت ہے، بلکہ اصحاب احسان (صوفیہ) کے نزدیک تو علم، عمل اور احسان کے مجموعہ کا نام فقہ ہے۔ اسی بنا پر جلیل القدر تابعی عالم حضرت حسن بصری نے فقہ کی تعریف اس طرح کی ہے:

" انما الفقیه المعرض عن الدنیا الزاهد فی الآخرة البصیر بعیوب نفسه" (در مختار مع رد المحتار ص ۲۹، ج ۱)۔ فقیہ وہ ہے جو دنیاوی طمع سے آزاد، آخرت کی فکر اور اپنے نفس کے عیوب پر نظر رکھتا ہو۔

لیکن چونکہ ہمارا موضوع معروف اور اصطلاحی فقہ کا تعارف ہے اس لیے ہم اسی مخصوص دائرہ میں اپنی گفتگو اصلاً محدود رکھنے پر مجبور ہیں۔ تفصیلی بحث سے قبل یہاں ایک اور جلیل القدر اصولی عالم کی بیان کردہ (فقہ کی) تعریف کا ذکر خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ یہ تعریف هندوستان کے صوبہ بہار کے مسلم الثبوت اصولی

اور معقولی عالم کی اصول فقه کی "مسلم الثبوت" نامی کتاب سے نقل کی جارہی ہے :

"انه العلم بالاحکام الشرعیه عن ادلتها التفصیلیه" (مسلم الثبوت، ص ۳).

تفصیلی دلائل کے ساتھ شرعی احکام جاننا .

اس تعریف کا حاصل یه نکلا که تنہا مسائل شرعیه (متعلقه بالأعمال الحسیه) کا جان لینا هی "فقه" نہیں ہے، بلکه هر مسئله کے ساتھ اسکی شرعی دلیل کا جاننا بھی "فقه" کی حقیقت میں داخل ہے. اس تعریف کی هی بنا پر فقه کے دائرے سے "مقلد محض" کا علم خارج هو جاتا ہے (کیونکه "تقلید" کے معنی دوسرے کی بات حسن ظن کی بنا پر بلا دلیل جانے مان لینے کے ہیں ۱ دیکھیے المستصفی'، ص ۳۸۷، ج ۲ و مسلم الثبوت، ص ۴۰۰ ج ۲ .

لیکن اب سوال یه پیدا هوتا ہے که تعریفوں کا یه فرق کیوں ہے ؟ اس کے صحیح جواب کی طرف گیارهویں صدی هجری کے مشہور فقیه محمد علاؤالدین الحصکفی (المتوفی: ۱۰۸۸ ھ) کی حسب ذیل عبارت رهنمائی کرتی ہے. فرماتے ہیں :

عند الأصولیین (الفقه) العلم بالأحکام الشرعیة الفرعیه المکتسب من ادلتها التفصیلیه و عندالفقهاء حفظ الفروع (در مختار مع رد المختار، ص ۲۶ جلد اول).

علمائے اصول کے نزدیک تو 'فقه' کے معنی تفصیلی دلائل کے ساتھ شرعی احکام جاننے کے ہیں اور فقہاء کے یہاں صرف تفصیلی احکام جاننے کے ہیں .

معلوم هوا که یه دو علمی حلقوں کا اصطلاحی اختلاف ہے یعنی علماء اصول فقه کے حلقه میں فقه کی وہ تعریف ہے جو ملا بہاری کے حواله سے نقل هوئی اور عام فقہاء کے یہاں فقه اسے کہتے

---

(۱) ادب القاضی للماوردی میں تقلید کی تعریف یه کی گئی ہے : أما التقلید فهو قبول قول بغیر دلیل "ص ۲۶۹، ج ۱، طبع بغداد سنه ۱۳۹۱ یعنی ۱۹۷۱ ء .

ہیں جیسا ذکر امام غزالی نے کیا ہے۔ بہت سے علماء نے تصریح کی ہے جنمیں ماضی قریب کے مشہور صاحب تصانیف کثیرہ اور وسیع العلم فقیہ علامہ محمد امین الشہیر بابن عابدین (م: ۱۲۵۲ھ) (شامی، ص ۲۶ ج ۱ میں) بھی ہیں کہ فقیہ کا لفظ مجرد مسائل شرعیہ کے جاننے والے پر بھی بولا جا سکتا ہے بلکہ بولا جاتا رہا ہے۔

اوپر بار بار "احکام" کے ساتھ "شرعیہ" کی قید ذکر میں آتی رہی ہے اور یوں بھی "شریعت" اور "شرعی" جیسے الفاظ ہر دیندار مسلمان کی زبان پر ہمہ وقت جاری رہتے ہیں۔ اس لیے نامناسب نہ ہوگا اگر اس تعبیر کی علمی توضیح بھی سامنے آجائے۔ اصول فقہ کی مشہور کتاب "التوضیح"، ص ۱۲ (فی حل غوامض التنقیح) للعلامہ صدرالشریعہ عبیداللہ بن مسعود البخاری الحنفی (م: ۷۴۷ھ) میں اس کی تعریف اس طرح ہے: "أی خطاب اللہ تعالی بمایتوقف علی الشرع" اور اس کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے:

المراد بالا حکام الشرعیہ مالا یدرک لولا خطاب الشارع سواء کان الخطاب بنفس الحکم او بنظیرہ المقیس علیہ لیخرج عنہا مثل الأ حکام الما خوذۃ من العقل .	یعنی وہ احکام جو عقل انسانی سے معلوم نہیں ہو سکتے بلکہ صرف اللہ کے بتانے سے ہی معلوم ہو سکتے ہیں یا پھر ان (منصوص احکام) پر قیاس کے ذریعہ دریافت ہوئے ہوں۔

علم فقہ کا موضوع: تعریف کے بعد موضوع اور غایت کا بیان ہو جانا بھی مناسب ہے کیونکہ جب تک کسی فن کا موضوع معلوم نہ ہو اس وقت تک علیٰ وجہ البصیرت اس فن میں اشتغال ممکن نہیں ہوتا ہے۔

موضوعہ فعل المکلف ثبوتا او سلبا (ای من حیث ثبوت التکلیف بہ کالواجب و الحرام او سلبہ کالمندوب و المباح) (ردالمحتار، ص ۲۶، جلد ۱).	اس کا موضوع انسانی اعمال ہیں خواہ وہ کرنے کے ہوں یا نہ کرنے کے، مثلاً واجب، حرام مستحب وغیرہ

مطلب یہ ہے کہ علم فقہ میں خدا وند تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لیے دیئے ہوئے وہ احکام زیر بحث آتے ہیں جن کا تعلق اس کے کرنے یا نہ کرنے سے ہے۔ معلوم ہوا کہ بحث یہ ہوگی کہ از روئے شریعت انسان کو کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے؟ اس طرح فقیہ کی نظر و فکر کا دائرہ انسان کی ہر قسم کی سرگرمیوں پر محیط ہو جاتا ہے اور اس کے واسطہ سے تمام کائنات میں انسان کے تصرفات اس کا موضوع بحث بن جاتے ہیں۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے آج کے فقیہ کی ضرورت اور اس کی ذمہداریاں ہر زمانہ سے زیادہ بڑھی ہوئی نظر آتی لگتی ہیں کیونکہ انسانی تصرفات کا میدان آج جتنا وسیع ہے اس سے قبل کبھی نہ تھا تو آج علم فقہ کی جتنی ضرورت ہے یا ہونی چاہیے اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں اصل مقصد ("اصول شریعت کا بیان") کی طرف آنے سے پہلے علمی طریق بحث کا ایک اور تقاضا پورا کرتے چلنا بھی مناسب بلکہ ضروری معلوم ہو رہا ہے، اور وہی در اصل سچ پوچھیے تو اس تمام تگ و دو اور کد و کاوش کا بالذات منتہائے مقصود ہے، یعنی یہ دریافت کرنا کہ اس فن کی غرض و غایت کیا ہے؟

علم فقہ کا مقصد اس کا مقصد صرف دنیاوی سدھار، امن و امان کا قیام، یا اس جیسے نفع عاجل کے اندر منحصر نہیں بلکہ اس سب کے ساتھ اور سب سے بڑھ کر آخرت کا نفع اور وہاں کی کامیابی اس فن کی غایت اصلی قرار دی گئی ہے۔ یہی در حقیقت وہ فرق ہے جو آج کی دنیا کی عام قانون ساز اسمبلیوں یا پارلیمنٹوں اور مقننوں کے نقطۂ نظر اور ان کے بنائے ہوئے قوانین سے فقیہ اور فقہ کو (مجتہد اور شرعی قوانین کو) بالکل ممتاز کر دیتا ہے۔ یہ فرق فقہ کی اس "غایت" جاننے سے واضح ہو جاتا ہے جو عام طور سے کتب فقہ میں بتائی گئی ہے۔ مثلاً فقیہ ابن عابدین شامی نے یہ لکھا ہے:-

غایته : سعادة الدارین (ای دارالدنیا اس کی غرض اصلی دنیا و آخرت
بنقل نفسه من حضیض الجهل إلیٰ دونوں میں کامیابی حاصل کرنا

فروۃ العلم وبیان مالناس وما علیہم لقطع الخصومات، و دار الآخرۃ بالنعم الآخرۃ) در مختار مع ردالمختار، ص ۲۰، ج ۱۔

ہے اس طرح کہ جہل کے گڑھے سے نکل کر پہلے علم کی بلندیوں تک پہنچے اور یہ جانے کون سے کام انسان کے لیے مفید ہیں اور کون سے مضر تاکہ جھگڑے بھی ختم ہوں اور (ان احکام پر عمل کر کے) آخرت کی بھی نعمتیں حاصل ہوں۔

مذکورہ بالا تعریف میں "مالناس وما علیہم" کے الفاظ دریا بکوزہ کا مصداق ہیں۔ اس کی کچھ تفصیل اور توضیح آٹھویں صدی ہجری کے مشہور مالکی عالم ابراہیم بن محمد موسی المعروف بأبی اسحاق الشاطبی (غرناطی: م: ۷۹۰ھ) کی شہرۂ آفاق کتاب ("الموافقات" ص ۳۸، ج ۱) سے پیش کی جارہی ہے۔ موصوف ایک خاص سیاق میں فرماتے ہیں:-

اتفقت الأمۃ ..على أن الشریعۃ وضعت للمحافظۃ على الضروریات الخمسۃ، وهی الدین و النفس و النسل و المال و العقل.

پوری امت کا اس پر اتفاق ہے کہ شریعت، کی وضع، پانچ ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہوئی ہے اور وہ ہے جان نسل، مال اور عقل۔

اور اپنے اس بیان کو مدلل کرتے ہوئے مزید تحریر فرماتے ہیں: "و علمها عند الأمۃ کالضروری" (الموافقات، ص ۳۸، ج ۱)

واقعہ یہ ہے کہ اس سے زیادہ مختصر اور جامع طریقہ پر شریعت کے مقاصد، بلکہ انسانی تقاضوں کا بھی نقشہ پیش کرنا مشکل ہے، اس تشریح کا نہ صرف یہ فائدہ ہوگا کہ فقہ کا جامع اور کامل تصور سامنے رکھنے میں مدد ملے گی بلکہ فقیہ (اور اسی طرح فقہ) کے بارے میں تنگ نظری و تنگ دامنی کا جو الزام عائد کیا جاتا ہے اس کی تردید بھی کم سے کم علمی محور پر تو ہو ہی جائے گی۔ اس کے ساتھ یہ بھی امکان ہے کہ فقیہ کو اس کی ذمہ داریوں

کی وسعت کا احساس جاگ جائے پھر کیا بعید ہے کہ وہ ان کی ادائیگی کی طرف متوجہ ہو جائے اور کیا عجب ہے کہ اسی تقاضہ کے بقدر ہمت و قوت صرف کرنے کا داعیہ بھی پیدا ہو جائے اور پھر خدا کی مدد سے وہ تمدن جدید کی پیدا کردہ مشکلات کا صحیح علمی حل پیش کرکے ساری دنیا کو اپنا ممنون اور گرویدہ ہی نہ بنالے بلکہ دنیا کی ایک اہم ضرورت پوری کر دے۔

ادلہ ثلاثہ | آپ حضرات بھولے نہ ہوں گے کہ فقہ کی دوسری تعریف کے اندر "احکام شرعیہ جاننے کے ساتھ" "دلائل" سے واقف ہونے کا بھی ذکر آیا ہے وہ "دلائل" (ادلہ یا اصول) دراصل تین ہیں: کتاب اللہ، سنت، اجماع[1]، چوتھی چیز قیاس بتائی جاتی ہے لیکن درحقیقت وہ کوئی مستقل دلیل نہیں[2] ہے بلکہ ان تین ہی میں سے کسی ایک کا خاص استداد اور اثر ہوتا ہے جسے سہولت کے لیے "دلیل" یا "اصل" کے نام سے یاد کر لیا جاتا ہے، اسی لیے قیاس کو فقہاء مثبت "نہیں "مظہر" کہتے ہیں:-

---

(۱) یہ بات تقریباً تمام متعلقہ کتابوں میں ملی ہے مثلاً دیکھیے "المستصفیٰ" ص ۵، ج ۱، اور "ادب القاضی" للماوردی ج ۱ ص ۲۷۷ میں ہے:- الاصول الشرعیہ اربعۃ، الکتاب و السنۃ و الاجماع و القیاس. ج ۱، ص ۲۰ شرح المنہاج للاسنوی (م: ۷۷۲ھ) میں ہے: اولۃ الفقہ تنقسم إلى متفق علیہا بین الائمۃ الأربعۃ و إلى مختلف فیہا فا المتفق علیہا اربعۃ. اور "المنار" میں ہے: اعلم ان أصول الشرع ثلاثۃ، الکتاب و السنۃ و اجماع الامۃ و الأصل الرابع القیاس (مع الشرح ص ۸ ج ۱).

(۲) مصنف "المنار" شیخ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد المعروف بحافظ الدین النسفی نے (م: ۷۱۰ھ) خود ہی "المنار" کی شرح "کشف الاسرار" نام سے لکھی ہے. وہ اس میں اپنی عبارت "الرابع القیاس" کی شرح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ہو أصل اظرا الینا....ولیس بأصل حقیقۃ" اذلا دخل للرأی فی اثبات الأحکام فہو مفوض الیہ تعالیٰ...بل ہوفرع لہذا الثلاثۃ (الکتاب و السنۃ، اجماع الامۃ) دیکھیے کشف الاسرار ج ۱ ص ۸ طبعۃ اولی بولاق مصر ۱۳۱۶ھ.

حضرت مولانا طیب نے ایک موقعہ پر کیا خوب وضاحت کی ہے کہ جس کا مفہوم یہ ہے کہ "قرآن و سنت سے شریعت بنتی ہے اور اجماع و قیاس سے کھلتی ہے۔

ادلہ ثلاثہ میں کتاب اللہ | یہ اصول ثلثہ (یا ادلہ ثلاثہ) کہنے کو تو صرف تین ہیں مگر ان تین کے دلیل بننے کی صلاحیتوں اور دیگر پہلوؤں کے اعتبار سے اتنی زیادہ صورتیں ہو جاتی ہیں کہ سب کا ذکر بہت ہی تفصیل کا طالب ہے۔ ان میں پہلا نمبر کتاب اللہ کا ہے۔

اس کی اصطلاحی تعریف یہ ہے:-

"هو القرآن المنزل على رسول الله صلى الله عليه وسلم المكتوب في المصاحف المنقول عن النبي عليه السلام نقلا متواترا بلا شبهة.	وہ قرآن مجید ہے جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اور مصاحف میں لکھا ہوا ہے نیز نبی اکرم صلی اللہ وسلم سے (لیکر آج تک) بطریق تواتر اور ہر شبہ سے بالاتر ہو کر پہنچا ہے۔

اس تعریف کا ہر ہر کلمہ اور ہر ہر لفظ اپنی خاص قیمت اور مصلحت رکھتا ہے۔ مجرد توصیفی الفاظ نہیں ہیں۔

جب قرآن مجید کا ذکر چھڑا ہی ہوا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں چند اور وہ باتیں عرض کر دی جائیں جو اگرچہ براہ راست موضوع کے لیے کچھ زیادہ ضروری تو نہیں مگر بالکل بے تعلق بھی نہیں ہیں۔ مثلاً یہ کہ قرآن مجید کے نزول کی ابتداء کس تاریخ سے ہوئی؟ اس میں سب کا اتفاق ہونے کے باوجود کہ مہینہ رمضان المبارک کا تھا، اس بارے میں بہت اختلاف ہے کہ تاریخ کیا تھی۔

عصر حاضر کے مشہور وسیع النظر مصری عالم علامہ محمد الخضری بک مرحوم نے اپنی مایہ ناز تصنیف "تاریخ التشریع الاسلامی" ص ٦٥

میں بدلائل ۲۱ رمضان المبارک کو ترجیح دی ہے۔ موصوف نے اسی طرف سیرت و مغازی کے امام محمد ابن اسحاق کا میلان بھی بتایا ہے، اور انہوں نے آخری آیت " الیوم اکملت لکم دینکم الخ" قرار دی ہے (حالانکہ اکثر محققین کے نزدیک سورۂ بقرہ کی آیت "واتقوا یوما ترجعون الخ" آخری آیت ہے لیکن بیشتر مفسرین نے اسی کو آخری کہا ہے)۔ اور یہ باتفاق نو ذی الحجہ ۱۰ھ جمعہ کے دن نازل ہوئی۔ اس طرح ابتداء و انتہائے نزول قرآنی کے درمیان کل مدت ۲۲ سال ۲ مہینہ ۲۲ دن ہوتی ہے۔

قرآن مجید کے تعلق سے ایک اور بات کا تذکرہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ قرآن مجید کی کتنی آیات احکام شرعیہ کا سرچشمہ ہیں؟ اگرچہ اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ پورا قرآن مجید کتاب اللہ ہے اور اس کے ہر ہر جز سے کوئی نہ کوئی شرعی حکم متعلق ہے۔ مثلاً یہ کہ ہر جزو نماز میں مقرو بن سکتا ہے اور قراۃ کا فریضہ اس سے ادا ہو سکتا ہے، لیکن یہاں ایک اور حیثیت سے گفتگو ہے وہ یہ کہ کتنی آیتوں میں شرعی احکام دیے گئے ہیں۔

اس بارے میں زمانۂ قدیم سے اختلاف چلا آرہا ہے۔ راقم سطور کے نزدیک اس کی نوعیت نزاع لفظی کی سی ہے۔ کیونکہ یہ اختلاف نقطۂ نظر کا نہیں بلکہ ایک طرح سے اصطلاح کا ہے۔ اس موضوع پر سب سے زیادہ مبسوط اور علمی انداز میں جامع بحث ہمارے ہی عصر کے ایک جوان سال افغانی عالم ڈاکٹر موسیٰ توانا کی کتاب "الاجتہاد (ص ۱۸۰ و ۱۸۱) و مدیٰ حاجتنا الیہ فی ہذا العصر" میں ملتی ہے (یہ کتاب دراصل پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے جس پر انہیں جامع ازہر سے ۱۹۷۲ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی) اس کتاب میں علماء کی آراء و اقوال کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، ان تمام آراء و اقوال پر گہری نظر ڈالنے سے راجح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ پورا قرآن مجید ہی احکام شریعت کا منبع ہے، یہ الگ بات ہے کہ کسی حصہ کی یہ حیثیت زیادہ نمایاں ہے،

کہ اس کی طرف ہر ایک کی نظر چلی گئی اور کسی کی نسبة خفی، جس پر صرف خواص ہی مطلع ہو سکے ہیں (و فوق کل ذی علم علیم).

قرآن مجید کے بارے میں اللہ کے لیے مذکورہ بالا امور جاننے کے علاوہ فہم مطالب اور اخذ مسائل کے سلسلے میں اور بھی بہت سی بحثوں کا علم ضروری ہے، مثلاً عام، خاص، مقید، مطلق، دلالة النص، اشارة النص وغیرہ امور کا، نیز، اختلاف کے مواقع پر ترجیح کے اصول جاننا، لیکن ہم کتاب اللہ کے بارے میں سر دست اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں.

سنت: اس کے بعد ادلہ اربعہ میں سے دوسری دلیل "سنت" کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے پہلے "سنت" کی علمی تعریف اپنے الفاظ میں بیان کرنے کے بجائے الشیخ الامام جمال الدین الاسنوی (م ۷۷۲ھ) کے الفاظ میں پیش کی جاتی ہے. موصوف اپنی مشہور کتاب "نہایة السؤل فی شرح منہاج الاصول" للقاضی بیضاوی (م ۶۸۵ھ) میں تحریر فرماتے ہیں اور یہاں یہ ذکر کر دینے میں بھی مضایقہ نہیں معلوم ہوتا کہ ہمارے مطالعہ میں جن علماء کبار کی بیان کردہ تعریفیں آئیں ان میں اپنی جامعیت نیز افادیت و اختصار کے لحاظ سے الأسنوی کی حسب ذیل تعریف ہی ممتاز نظر آئی:

السنة لغة هی العادة و الطریقة، قال الله تعالیٰ: قد خلت من قبلکم سنن فسیروا فی الارض ای طرق، و فی الاصطلاح تطلق علی ما یقابل الفرض من العبادات و علی ماصدر من النبی صلی الله علیه وسلم من الأفعال او الاقوال التی لیست للاعجاز و هذا هو المراد هنها (نہایة السؤل، ص ۵۲ ج ۲ برحاشیه التقریر و التحبیر).

سنت، کے لغوی معنی عادة اور راستہ کے ہیں. . . . لیکن اصطلاحی معنی ایک تو وہ ہے (جو عوام میں بھی مشہور ہیں، کہ) فرض سے کم درجہ میں مطلوب عمل — اور ایک معنی ہیں ہر وہ بات جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہوئی ہے، خواہ فعل ہو یا قول ہو، بشرطیکہ معجزانہ نہ ہو، یہاں یہی مراد ہے.

پھر کیف سنت، ذات نبوی (علیہ الف الف صلوٰۃ و سلام) سے وابستہ امور کا نام ہے۔ یہاں ایک بحث غلط فہمیوں کا شکار ہونے سے بچانے کے لیے یہ بھی کی جاتی ہے کہ سنت کا اصل یا دلیل ہونا کس "اصل" یا "دلیل" سے ثابت ہے؟ حالانکہ رسول کو سچا رسول (من جانب اللہ) مان لینے کے بعد منطقی طور پر یہ بحث فضول قرار پاتی ہے مگر ہمارے اسلاف نے مذکورہ بالامصلحت پر نظر رکھتے ہوئے جس کی اہمیت آج اس وقت سے کہیں زیادہ ہو گئی ہے اس سوال کا جواب بھی دیدیا ہے کہ سنت کا اصل ہونا کس دلیل سے ثابت ہے۔ چنانچہ انہوں نے قرآن مجید کی متعدد آیات اس بارے میں پیش فرمائی ہیں۔ مثلاً وما آتکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا (الحشر ع ۸) و انزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیہم (النحل ع ۳۳) یا أیہا الرسول بلغ ما انزل الیک و إن لم تفعل فما بلغت رسالتہ (المائدہ ع ٦٧) یہ آیات، "سنت" کے حجت ہونے کے دلائل کے طور پر متعدد علماء نے پیش فرمائی ہیں (ہم نے یہاں اقضی القضاۃ ابوالحسن علی بن محمد الماوردی الشافعی (م ۴۵۰ھ) کی مشہور کتاب "ادب القاضی" ص ۳٦۸، ج ۱ سے، نقل کی ہیں۔ خود راقم کا ایک طویل مقالہ بھی اس موضوع پر عربی اور اردو میں شائع ہو چکا ہے تفصیل کے طالب کے لیے اس کا مطالعہ مفید ہوگا ("البعث الاسلامی" اور "معارف" میں) اس سلسلہ میں ایک بحث یہ بھی اٹھتی ہے کہ "سنت" کو حجت مان لینے کے بعد اس کی حجیت کتاب اللہ کے برابر ہے یا اس سے متفاوت؟ اس بارے میں پانچویں صدی ہجری کے مشہور وسیع النظر جلیل القدر محدث عالم، الامام الحافظ ابوبکر احمد بن علی بن ثابت المعروف بالخطیب البغدادی (م ۴۶۳ھ) کی شہرہ آفاق کتاب "الکفایہ" کے کچھ مندرجات سے جو حقیقت واضح طور پر سامنے آتی ہے وہ یہی ہے کہ دونوں کا درجہ باعتبار اتباع کے اصلاً برابر ہے اور یہی عام طور پر اہل حق کا مسلک ہے، بس جو کچھ فرق ہے وہ طریق ثبوت کی وجہ سے ہے کہ سنت، سب کی سب متواتراً منقول نہیں ہے برخلاف کتاب اللہ کے کہ وہ ساری کی ساری متواتراً منقول ہے۔

"سنت" سے ہی ملحق ایک پہلو اور بھی قابل ذکر ہے، وہ یہ کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اقوال بھی حجت ہیں یا نہیں؟ کتب متعلقہ کی مراجعت سے پتہ چلتا ہے کہ اس بارے میں فقہاء متقدمین کے درمیان کچھ اختلاف رہا ہے، لیکن چند حضرات کے علاوہ باقی تمام فقہاء و علماء کا مسلک یہ ہے کہ صحابی کا قول حجت ہے۔ اس کی حجت پر سب سے زیادہ تفصیلی کلام علامہ ابن تیمیہ کے ممتاز شاگرد امام شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن ابی بکر المعروف بابن القیم الجوزیہ (م: ۷۵۱ھ) نے "إعلام الموقعین" میں کیا ہے اور سیم دلیلیں اس پر قائم کی ہیں۔

خلاصۂ بحث کے طور پر علامہ معروف الاندلسی کے کلام کا ایک حصہ نقل کر دینا مناسب معلوم ہو رہا ہے، جس سے زیر بحث موضوع پر مفید اضافہ ہوگا:-

إن روح الإسلام قد ثبت في نفوس الصحابة... و ذلك كان بفضل رفقتهم للنبي عليه الصلواة و السلام و تشربهم لتلك الروح مباشرة من ينبوعها و مشاهدتهم لعصر التنزيل و إن هذا ما جعلهم اقدر الناس على فهم مقاصد الشريعة و أعلمهم بمراده و لهذه الاسباب لمسها أجمع العلماء على الإعتداد بآراء الصحابة.... فاذا أجمع الصحابة على أمر من الأمور الاجتهادية فالعلماء مجمعون على متابعتهم و اذا اختلفوا فمن العلماء من رأى الأخذ ببعضهم دون الخروج عن اقوالهم كلهم و منهم من اجتهد و عمل با جتهاده (المدخل، ص ۱۰۵).

حضور اکرام اللہ علیہ کی ہم نشینی کی برکت سے اور زمانۂ نزول قرآن کے مشاہدہ کی بنا پر صحابۂ کرام کے رگ و ریشہ میں اسلام رچ بس گیا تھا۔ اسی وجہ سے پوری نسل انسانی کے مقابلہ میں وہی شریعت کے مقاصد کو زیادہ سمجھنے والے بن گئے انہیں اسباب کی بنا پر صحابہ کی رائے کو اہمیت دینا تمام علماء کا متفقہ طرز عمل ہے، اگر کسی اجتہادی بات پر تمام صحابہ متفق ہو جائیں تو سارے علماء ان کی اتباع کو ضروری قرار دیتے ہیں، ہاں اگر ان کے درمیان اختلافات ہوں تو پھر اس بارے میں علماء کی آراء مختلف ہیں، بعض

کی رائے یہ ہے کہ ان ہی کے
اندر رہنا ضروری ہے، ان سے باہر
نکلنا صحیح نہیں، بعض نے ایسی
صورت میں صحابہ کی آراء کے دائرہ
میں رہنا ضروری نہیں سمجھا بلکہ
اس سے الگ بھی—اپنے اجتہاد
سے—رائے قائم کرنے کی گنجائش
سمجھی۔

"سنت" کے سلسلہ میں بھی ایک بحث یہ پیدا ہوتی ہے کہ احادیث احکام کی تعداد کتنی ہے؟ اس میں علماء کے مختلف اقوال ملتے ہیں، پانچ سو سے لے کر پانچ لاکھ تک کی تعداد ذکر کی گئی ہے، امام احمد نے چار لاکھ (اور ایک روایت کے مطابق پانچ لاکھ) تعداد کا حفظ، فقیہ بننے کے لیے کافی قرار دیا ہے، (تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے "إعلام الموقعين" ص ٥٠، ج ١) (ارشاد الفحول، ص ٢٣٣، بحوالہ إلا جتهاد، ص ١٨٥) حدیث کے سلسلہ میں ایک اہم بحث اس کی صحت و قوت، نیز ضعف و نکارت وغیرہ سے متعلق ہے، جس پر ضخیم سے ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں، اور مستقل فن بن گیا، اسی فن سے بھی فقیہ کو حظ وافر حاصل ہونا ضروری ہے لیکن یہاں اس بارے میں مختصر تذکرہ سے بھی گریز کیا جارہا ہے کہ "مختصر" کے لیے بھی "دفتر" چاہیے۔

اجماع | اس کے بعد تیسری اصل (یا دلیل) "اجماع" کا نمبر ہے جس کی کچھ تفصیل ذیل میں بیان کی جاتی ہے۔

"اجماع" کی تعریف | "إجماع" کے لغوی معنی "عزم" کے ہیں اور لغوی معنی میں قرآن مجید کے اندر بھی متعدد جگہ استعمال ہوا ہے مثلاً "فا جمعوا أمر کم و شرکاء کم" (سورہ یونس، آیت نمبر ٧١) اصطلاحی معنی اور اس کی تفصیل آگے آرہی ہے، اجماع کے بارے میں کتب اصول کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت اختلافات

یہ یہاں بس چند ہی اختلافی پہلوؤں پر روشنی ڈالنا مناسب سمجھتے ہوئے مختصر گفتگو کی جائے گی امام شافعی رحمۃاللہ علیہ کے نزدیک (محقق شہیر شیخ ابو زہرہ کی تحقیق کی مطابق) اجماع نام ہے ایک زمانہ کے تمام علماء کا کسی امر پر بصراحۃ بالقول متفق ہو جانے کا (الشافعی، ص ۲۵۱ الشیخ ابی زہرہ) امام مالک کے نزدیک اهل مدینہ کا اتفاق شرط ہے، امام ابو حنیفہ رحمۃاللہ کے نزدیک "اجماع" کی تعریف تقریباً وہی ہے جو امام شافعی رحمۃاللہ علیہ سے منسوب ہو کر مذکور ہوئی، تھوڑا بہت جو اختلاف ہے اس کی کچھ تفصیل آگے آرہی ہے ("شرائط اجماع" کے تحت).

"اجماع" کی تعریف کے بارے میں اختلاف کی جھلک دیکھنے کے بعد اب آئیے دیکھیں کہ اس کے حجت ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں کیا کیا اختلافات ہیں؟ نیز اس کی حجیت کے لیے کیا کیا شرائط ہیں، فی نفسہ اجماع کے حجت ہونے میں اهل حق کے درمیان تو چنداں اختلافات نہیں ہیں کیونکہ اهل حق میں جن سے اختلاف منقول ہے (مثلاً امام احمد علامہ ابن حزم ظاہری، متوفی ۴۵۶ ھ، صاحب إحكام الأحكام) ان کا مطلب دراصل یہ ہے کہ اجماع کے متحقق ہونے کی جو شرطیں ہیں وہ عملاً پائی ہی نہیں جاتیں ان کا پایا جانا نہایت مشکل، قریب بمحال ہے.

"اجماع" کے حجت ہونے پر دلائل| اجماع کو حجت ماننے والوں کی طرف سے سب سے قوی اور احسن دلیل قرآن مجید کی یہ آیت بتائی گئی ہے:

و من يشاقق الرسول من بعد ماتبين له الهدى ويتبع غير سبيل المؤمنين نوله ماتولى و نصله جهنم (سورة نساء).	هدایت واضح ہو جانے کے بعد جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرے گا اور عام مسلمانوں کی راہ سے الگ راہ اختیار کرے گا ہم اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں گے اور جہنم میں جلائیں گے.

استدلال اس طرح ہے کہ اس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے برابر "سبیل المؤمنین" سے ہٹنے کو بتایا گیا ہے

اور دونوں کی سزا بھی ایک ہے، یعنی جہنم ذکر کی گئی ہے.
اس آیت سے "اجماع" کی حجیت پر استدلال تقریباً ان سب نے کیا
ہے جو اسے حجت سمجھتے ہیں لیکن اس سے بھی واضح اور صریح دلیل
وہ حدیث نبوی ہے جس میں صاف صاف کہا گیا ہے "لا تجتمع امتی
علی الضلالة" اس حدیث کے بارے میں مشہور محدث اور ناقد حدیث
علامہ سخاوی کی رائے یہ ہے کہ ایک ایسی حدیث ہے جس کا متن
مشہور ہے اس کی اسانید کثیر اور شواهد متعدد ہیں، علامہ ابن حزم
اندلسی جو اجماع کے عملاً "متحقق" ہونے کا انکار کرتے ہیں
لیکن اس کے باوجود فرماتے ہیں "محدثین کہتے ہیں کہ یہ بات
بالکل درست ہے کہ امت بحیثیہ کبھی غیر حق پر متفق نہیں ہو
سکتی" "لا تجتمع امتی علی ضلالة" کے الفاظ و سند اگرچہ درجۂ صحت
کو نہیں پہونچتے، لیکن اس کا مفہوم اور نتیجہ ان احادیث کی
بنا پر جن میں ہر دور کے اندر حق پر قائم رهنے والوں کی خبر
دی گئی ہے صحیح اور ثابت ہے (الا حکام، ص ۱۳۱، ج ۴) اسی طرح
شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃاللہ علیہ اجماع کے تحت میں ایک جگہ
لکھتے ہیں: "امت کا اجماع اپنی جگہ برحق ہے"[1] ("فتاوی
ابن تیمیہ" ص ۱۷٦، جلد ۱۹ بحوالہ منصب نبوت، ص ۸۱).

<u>شرائط اجماع</u> امام ابو حنیفہ رحمۃاللہ علیہ اور ان کے متبعین
کے نزدیک، اجماع کے انعقاد کی شرطیں حسب ذیل ہیں: کسی
بھی عصر کے اہل عدالہ و اجتہاد اتفاق کرلیں، اور خواہ وہ
کہیں کے رهنے والے ہوں سب کا اتفاق صریح قول کے ذریعہ ہونا
بھی ضروری نہیں بلکہ اگر کچھہ اہل اجماع نے ایک فتوی دیا
دوسرے خاموش رہے تب بھی اجماع منعقد ہو جائیگا اور چونکہ

---

(۱) علامہ ابن تیمیہ کے تلمیذ خاص حافظ ابن قیم رحمہ اللہ علیہ
"اعلام الموقعین، ص ۳۲، ج ۲" میں اس پیشن گوئی کا تاریخی اور
واقعاتی ثبوت اس طرح پیش کرتے ہیں کہ: خدا کا شکر ہے کہ
پوری امت ایک سنت ترک کرنے پر ابھی کبھی مجتمع نہیں ہوئی
سوائے اس ... [illegible]

احناف کے نزدیک اجماع کے لیے قول صریح کے ذریعہ تمام علماء کا اتفاق ضروری نہیں بلکہ بعض کا سکوت بھی کافی ہے اور عملی اتفاق بھی، اس لیے مشہور حنفی فقیہ شیخ عبدالعزیز بخاری نے شرح اصول بزدوی میں اجماع کے چار طریقے بتائے ہیں (۱) اجماعی رائے (۲) تعامل اجماعی (۳) رای بعض المفتین مضوبا مکوت الباقین رهی التعامل لدی بعض المفتن دون هذا التعامل فدا عترض علمه من قبل الباقین (کشف الاسرار، ص ۲۲۸ و ۲۲۶ . شرح اصول البزووی بحواله المدخل ص ۵۰).

لیکن ان تمام طریقوں سے حاصل ہونے والے اجماع کی حیثیت و قوت یکساں نہیں ہو گی بلکہ اس میں فرق مراتب ہے، اسی اعتبار سے اجماع سے معلوم ہونے والے مسائل کی نوعیت اور قوت میں بھی فرق ہو گا۔

قیاس| چوتھی اور آخری دلیل جس سے شرعی احکام کا پتہ چلتا ہے "قیاس" ہے۔ شروع میں گزر چکا ہے کہ اس کے ذریعہ غیر ثابت شدہ حکم شرعی ثابت نہیں ہوتا بلکہ اصولی طور پر ثابت شدہ لیکن مخفی حکم کا پتہ چلایا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ صریح نص کی موجودگی میں قیاس سے حکم دریافت نہیں کیا جا سکتا، البتہ جس مسئلہ کا شرعی حکم، ادلہ ثلاثہ مذکورہ (کتاب، سنت، اجماع) میں بظاہر نہ ملتا ہو تو پھر قیاس کے ذریعہ اسے دریافت کیا جاتا ہے اسی لیے قیاس کی تعریف کی گئی ہے کہ "جس مسئلہ کا حکم شرعی صراحۃً نص میں نہ ملتا ہو اس کا حکم کسی ایسے حکم شرعی کی روشنی میں دریافت کیا جائے گا جو نص میں صراحۃً موجود ہو اور اس غیر معلوم الحکم اور اس معلوم الحکم میں "علت"[1] مشترک ہو[2] مثلاً گیہوں کو گیہوں کے بدلہ فروخت کیا جائے

---

(۱) وہ خاص وجہ یا سبب، جس پر حکم شریعت کا دارومدار ہوتا ہے "علت" کہلاتی ہے۔

(۲) "قیاس" کی مذکورہ بالا تعریف لفظی و تعبیری فرق کے ساتھ تقریباً تمام اصول فقہ کی کتابوں میں ملتی ہے۔ مثلاً "علم اصول الفقه" ص ۵۲ (عبدالوهاب خلاف) میں ان الفاظ سے کی گئی ہے: الحاق و اقعة لانص علی حکمها بواقعه ورد نص بحکمها فی الحکم الذی ورد به النص، لتساوی الواقعتین فی علة هذا الحکم.

تو کس طرح کیا جائے؟ اس کا حکم نص (سنت) میں موجود ہے (کہ برابر سرابر اور نقد فروخت کیا جائے) لیکن چاول کو چاول کے بدلہ فروخت کرنے کا حکم کسی نص میں صراحۃً نہیں ملتا، لہذا اس (نامعلوم الحکم) مسئلہ کا حکم معلوم الحکم مسئلہ پر قیاس کرکے دریافت کیا جائیگا۔ اور چونکہ گیہوں اور "چاول" میں وہ "علت" یعنی وہ خاص وصف جس پر مدار حکم ہے، مشترک موجود ہے اس لیے دونوں کا حکم اس صورت مسئلہ میں یکساں ہوگا۔

نئے مسائل کا حل| لیکن قارین کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ کسی حکم کے "نص" یا بالفاظ صحیح ادلہ ثلاثہ میں موجود ہونے نہ ہونے کا فیصلہ کرنا کتنا مشکل کام ہے کہ اس کے لیے تمام نصوص پر حاوی ہونا اور پھر ان کی دلالات کی قسموں یعنی موجودگی کے مختلف طریقوں سے پوری آگہی ضروری ہے۔ مزید برآں یہ کہ غیر معلوم الحکم اور معلوم الحکم مسئلوں کے درمیان علت مشترکہ کا پتہ چلانا بھی کم دشوار کام نہیں ہے۔ اس سب کے بغیر کسی غیر معلوم الحکم مسئلہ کا صحیح جواب دریافت نہیں ہو سکتا۔ ان تفصیلات سے فقیہ کے عمل کی نزاکت اور فقیہ ہونے کے لیے کن صلاحیتوں اور محنتوں کی ضرورت ہے اس کا ایک مختصر اور اجمالی سا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ نص میں (یا ادلہ ثلاثہ میں) بیان کردہ احکام بہر حال محدود ہیں اور پیش آمدہ مسائل اور ضرورتیں لا محدود! 'اسلام' اللہ تعالیٰ کا آخری دین اور یہ شریعت آخری شریعت ہے، جو قیامت تک رہنمائی کے لیے دنیا میں بھیجی گئی ہے۔

آخری دین کی قیامت تک راہنمائی کی صورت بجز اس کے اور کوئی نہیں ہے (اور نہ ہو سکتی ہے) کہ شریعت کے "اصول" کی روشنی میں پیش آمدہ مسائل کے حل اور جوابات دریافت کیے جائیں اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس دین کی قیامت تک بقا و حفاظت کی ضمانت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ قیامت تک، اصول و نصوص

کے متون کی بقاء و حفاظت کے ساتھ ایسے فقہاء و مجتہدین بھی برابر پیدا ہوتے رہیں جو حالات و زمانہ پر پوری طرح نظر رکھیں اور پیدا ہونے والے تمام مسائل کا حل پیش کرتے رہیں ۔

قانون‌ساز اداروں والا کام: دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ، آج کی آسمانی شریعت سے محروم ، یا خود کو اس سے بےنیاز سمجھنے والی دنیا میں جو کام یا ذمہ داری ، قانون ساز اداروں پارلیمنٹوں ، اسمبلیوں اور کونسلوں نے سنبھال رکھی ہے وہ درحقیقت (شریعت کے دائرہ میں زندگی گذارنے کا عزم رکھنے والے افراد اور حکومتوں کے لیے) فقہاء نے انجام دی یا یوں کہہ لیجیے کہ وہ ذمہ‌داری فقہاء کی ہے۔ فقہ کے دائرہ کی وسعت سے ناواقف لوگوں کو یہ بات شاید عجیب سی لگے مگر ابتداء مقالہ میں فقہ کی جو تعریف ذکر کی گئی ہے خاص طور سے امام شاطبی نے جو مقاصد شریعت (دین ، نفس ، نسل ، مال اور عقل کی حفاظت) بتائے ہیں ، اس کے پیش نظر فقہ اور فقیہ کے بارے میں اوپر کی سطروں کے اندر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس میں تأمل نہ ہونا چاہیے ۔ اس پر یہ اضافہ اور کر لیا جائے تو مناسب ہوگا کہ 'اسلام' کے نقطۂ نظر سے قوانین کے درمیان وہ تقسیم بھی نہیں ہے جو سکولر آئینوں میں احوال شخصیہ (پرسنل لا) اور عام شہری (یا تعزیزی) قوانین جیسی ملحوظ رکھی جاتی ہے کیونکہ یہاں (اسلامی شریعت میں) ایسا کوئی "شخصی دائرہ" ہے ہی نہیں جیسا کہ موجودہ سیکولر حکومتوں کے قوانین میں موجود ملتا ہے ۔ بلکہ مسائل زندگی خواہ انفرادی حیثیت کے ہوں یا اجتماعی ، تمدنی ہوں یا معاشرتی ، ثقافتی ہوں یا تعزیراتی ، معاملاتی ہوں یا عباداتی ، سب کے سب ایک ہی طریقے یا نسخے سے حل کیے جاتے ہیں اور وہ طریقہ یا نسخہ وہی ہے جو فقہ کے "ادلہ" کی بحث میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فقہ اور فقیہ کے ذمہ ان تمام ہی شعبہ‌ہائے قوانین سے متعلق مسائل کا حل دریافت کرنا ہے جن کا زندگی سے ربط ہے ۔

فقہ اور فقیہ کا کردار تاریخ کی روشنی میں: یہاں یہ سوال ذہنوں میں پیدا ہونا مستبعد نہیں کہ واقعۃً ماضی میں فقہ اور فقیہ نے اپنا یہ مختلف الجہات کردار ادا کیا بھی یا نہیں؟ کیونکہ صرف آج کے اور ماضی قریب کے حالات و واقعات جن کے سامنے ہیں وہ تو "فقہ" اور فقیہ کا دائرہ صرف عبادات و شبہ عبادات (مثلاً نکاح و طلاق وغیرہ) کے اندر محصور سمجھتے ہیں (بلکہ بسا اوقات اس حلقہ کی طرف سے اس سے بھی زیادہ محدود تصور کا اظہار ہوتا ہے) اس لیے مذکورہ سوال کا جواب دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ جواب سے پہلے عالم اسلام کے ایک ممتاز عالم جو دیانات و مذاہب کی تاریخ سے آگہی میں بھی امتیاز رکھتے ہیں، کا ایک اقتباس پیش کرنا مناسب لگ رہا ہے، جس سے معلوم ہوگا کہ فقیہ نے مذکورہ بالا کردار گذشتہ ہر زمانہ میں ادا کیا، یہ نہ صرف تاریخ کا سچا واقعہ ہے بلکہ اس جیسے کردار کے بغیر کوئی مذہب باقی ہی نہیں رہ سکتا۔ گویا یہ ایک تاریخی حقیقت ہی نہیں ایک ایسی اہم ضرورت بھی ہے جس پر دین قیم کی بقاء کا دارمدار ہے۔ اس تمہید کے بعد حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی شہرہ آفاق کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" کا اقتباس ملاحظہ کیجئے: کوئی مذہب اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا، ان خصوصیات کو زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رکھ سکتا اور بدلتی (دنیا میں) زندگی پر اثر نہیں ڈال سکتا جب تک وقتاً فوقتاً اس میں ایسے اشخاص نہ پیدا ہوتے رہیں جو اپنے غیر معمولی یقین، روحانیت، بےغرضی و ایثار اور اپنی اعلیٰ دماغی اور قلبی صلاحیتوں سے.... اس کے ماننے والوں میں نیا اعتماد اور جوش اور قوت عمل پیدا کر دیں، زندگی کے تقاضے ہر وقت جوان ہیں.... اس کا مقابل جب تک ایک نئی زندگی اور نئی طاقت کے ساتھ میدان میں نہیں آئے گا.... اس کا (دین کا) زندہ رہنا مشکل ہے (تاریخ دعوت و عزیمت ص ۲۷، ج ۱، بار سوم)۔

اس کے بعد مولانا موصوف نے اسلامی تاریخ کے اس ضروری تقاضے کے عملی شواہد بھی پیش کیے ہیں اور بتایا ہے کہ تھوڑا سا وقفہ بھی ایسا نہیں گذرا جس میں یہ تقاضہ پورا نہ کیا گیا ہو،

یہ حقیقت بھی مولانا یدظلہ کے ہی الفاظ میں سنیے (ضمناً اس میں فقہ کے اوصاف بھی آگئے ہیں): مسائل کا استنباط و استخراج، جزئیات و فتاوی' کی ترتیب، اسلام کی ایسی عملی ضرورت تھی جس کو بالکل مؤخر نہیں کیا جا سکتا تھا. اسلام جزیرۃ العرب سے نکل کر شام، عراق، مصر و ایران اور دوسرے وسیع اور زرخیز ملکوں میں پہنچ گیا تھا، معاشرت، تجارت انتظام ملکی، سب بہت وسیع اور پیچیدہ شکلیں اختیار کر گئے تھے، اس وقت نئے حالات و مسائل میں اس کام کے اصول کی تطبیق کے لیے بڑی اعلی' ذہانت، معاملہ فہمی، باریک بینی، زندگی اور سوسائٹی سے وسیع واقفیت، انسانی نفسیات اور اس کی کمزوریوں سے باخبری، قوم کے طبقات اور زندگی کے مختلف شعبوں کی اطلاع اور اس سے بیشتر (اور بڑھکر) اس کلام کی تاریخ و روایات اور روح شریعت سے گہری واقفیت، عہد رسالت اور زمانۂ صحابہ کے حالات سے پوری آگہی اور اسلام کے پورے علمی ذخیرے (قرآن و حدیث اور لغت و قواعد) پر کامل عبور کی ضرورت تھی. یہ اللہ کا بہت بڑا فضل تھا کہ اس کار عظیم کے لیے میدان میں ایسے لوگ آئے جو اپنی "ذہانت" دیانت، اخلاص و علم میں تاریخ کے ممتاز ترین افراد ہیں پھر ان میں چار شخصیتیں، امام ابوحنیفہ (متوفی: ۱۵۰ ھ) امام مالک (م: ۱۷۹ ھ) امام شافعی (م: ۲۰۴) امام احمد بن حنبل (م: ۲۴۱ ھ) جو فقہ کے چار دبستان فکر کے امام ہیں جن کی فقہ اس وقت تک عالم اسلام میں زندہ و مقبول ہے، اپنے تعلق باللہ، للہیت، قانونی فہم، علمی انہماک اور جذبۂ خدمت میں خاص طور سے ممتاز ہیں (ایضاً، ص ۸۰ و ۸۱). عصر حاضر کے ممتاز ترین عرب مورخ احمد امین مصری مرحوم نے اپنی قابل فخر تصنیف "ضحی الاسلام" (ص ۱۸۸، ج ۲) میں لکھا ہے کہ "مسائل پیش آنے سے پہلے ہی ان کا حل دریافت کر لینا امام ابوحنیفہ کا نظریہ تھا، چنانچہ امام ابو حنیفہ نے تراسی ہزار مسائل اپنی زبان سے بیان کیے ہیں، اڑتیس ہزار عبادت سے تعلق رکھتے ہیں اور پینتالیس ہزار معاملات سے مگر "مناقب الامام" میں کردری نے (ص ۱۴۴، ج ۱) امام ابوحنیفہ کے وضع کردہ مسائل کی تعداد پانچ لاکھ بتاتی ہے. مولانا ندوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ "المدونہ" میں

جو امام مالک کے فتاوی' کا مجموعہ ہے، چھتیس ہزار مسائل ہیں. کتاب ''الأم'' جو امام شافعی کے افادات کا مجموعہ ہے، سات ضخیم جلدوں میں ہے. ابو بکر خلال نے امام احمد کے مسائل چالیس جلدوں میں جمع کیے ہیں (تاریخ دعوت و عزیمت ص ۴۲، ج ۲) پھر یہ سلسلہ برابر جاری رہا. ان حضرات کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگردوں نے قائم رکھا، چنانچہ اس کا زندہ ثبوت فقہ و فتاوی' کے وہ مجموعے ہیں جن کی ضخامت و کثرت اندازہ و گمان سے بھی شاید زیادہ ہے فقہ حنفی ہی میں مطبوعہ تصانیف کی تعداد (ان کی ضخامت و وسعت سے قطع نظر) اتنی زیادہ ہے کہ تنہا اس کی فہرست کے لیے کئی مجلدات درکار ہیں. صاحب کشف الظنون (حاجی خلیفہ، م: ۱۰۶۷ھ) نے امام ابو حنیفہ کے ممتاز ترین شاگرد محمد جنہوں نے فقہ حنفی کو کتابی صورت میں مدون کیا، کی تصانیف کی تعداد ۹۹ بتائی ہے. اور کشف الظنون ہی میں ''فتاوی'' کے نام سے ۱۲۸ کتابوں کا یکجا ذکر ہے، نیز فقہ حنفی میں ''علم الفقہ'' عنوان کے تحت ۱۱۰ کتابوں کا. سرسری طور پر ان میں سے چند کا یہاں ذکر شاید نا مناسب نہ ہوگا:

''المبسوط'' ۳۰ ضخیم جلدیں (شمس الائمہ سرخسی، م: ۴۸۳ھ) ''خزانۃ الفقہ'' (امام ابو اللیث نصر بن محمد الفقیہ السمرقندی، م: ۳۸۳ھ) ''عیون المسائل'' ۹ جلدیں (ابوالقاسم عبداللہ بن احمد البلخی، م: ۳۱۹ھ) ''الواقعات للناطفی'' (احمد بن محمد بن عمر ابوالعباس الناطفی، تلمیذ الجصاص الرازی، م: ۴۴۶ھ) ''فتاوی' خانیہ'' ۳ جلدیں (امام فخرالدین حسن بن منصور الاوز جندی، م: ۵۵۲ھ) ''بدائع الصنائع'' ۷ جلدوں میں (ملک العلماء علاءالدین الکاسانی، م: ۵۸۷ھ). صاحب ہدایہ نے پہلے ''الکفایہ'' نامی ضخیم کتاب تیار کی پھر اس کا اختصار ''ہدایہ'' کے نام سے کیا جس کی شہرت ہر تعریف و تعارف سے بے نیاز ہے (علی بن ابی بکر برہان الدین المرغینانی، م: ۵۹۳ھ) ''المحیط البرہانی'' ۴۰ جلدیں (شیخ الاسلام العلامہ برہان الدین محمد، م: ۶۱۶ھ) ''الفتاوی' الحنفیہ'' (سعدالدین مسعود م: ۷۹۲ھ) ''الفتاوی' التتار خانیہ'' جس کی اب تک پانچ ضخیم

جلدیں (قاضی سجاد حسین دهلوی کی تحقیق کے ساتھ) شائع ہو چکی ہیں، ہر جلد کم و بیش آٹھ سو صفحات بڑے سائز، پر مشتمل ہے، پانچویں جلد کے نو سو صفحات سے بھی زیادہ ہیں، اندازہ ہے کہ ایسی ضخیم کم سے کم دس جلدوں میں سما سکے گا. (عالم بن العلاء الا نصاری، م: ۷۸۶ھ) "فتح القدیر" ۵ جلدیں (کمال الدین ابن همام م: ۸۶۱ھ) "البحر الرائق" ۷ جلدیں (زین الدین ابن النجیم، م: ۹۷۰ھ) "الدر المختار" شرح تنویر الابصار (علاءالدین الحصکفی، م: ۱۰۸۸ھ) "فتاوی عالمگیری" یہ مجموعه اورنگزیب عالمگیر کے حکم سے منتخب ترین علماء نے مرتب کیا اور جسے گویا "قوانین هند" کی دستوری حیثیت حاصل ہوئی (عالمگیر، م: ۱۱۱۸ھ) اس کے تقریباً ایک صدی بعد عثمانی حکومت جو صدیوں تک دنیا کا سب سے بڑا امپائر (EMPIRE) رهی ہے جس کے تحت ایشیا، یورپ اور افریقه کے متعدد ممالک تھے، اس نے رسمی قوانین کے لیے "المجلة الاحکام العدلیه" تیار کرایا. اسی صدی میں علامه ابن عابدین شامی (۱۲۵۲ھ) کی "الرد المختار" شرح "الدر المختار" سامنے آئی، اس کے بعد سے تو گویا فقه و فتاویٰ کا تنہا یہی مرجع بن گئی. اس کے بعد کی (چودھویں) صدی گویا هندوستانی علماء و فقہاء کی صدی ہے. جس میں یہاں ایسے اور اتنے علماء و فقہاء پیدا ہوئے جن کی نظیر اس صدی کے اندر عالم اسلام میں بھی ملنا مشکل ہے (ان کے کام اور نام سے عموماً تمام اهل علم واقف هی ہیں).

اس مختصر سے جائزه کے ذریعه یه حقیقت اچھی طرح سامنے آجاتی ہے کہ زمانۂ نبوت کے بعد کوئی خفیف سے خفیف وقفه ایسا نہیں گذرا جس میں امت کی رهنمائی کے لیے علماء و فقہا (ان صفات کے حامل (فرق مراتب کے ساتھ) جن کا تذکرہ مولانا ندوی کے حواله سے گزرا) موجود نه رہے ہوں اور انہوں نے راهنمائی نه کی ہو. اوپر کی تفصیلات سے یه اندازه بھی ہو گیا کہ ہر زمانه میں فقہاء نے فتاوی و تصنیفات کے ذریعه زندگی کے تمام گوشوں کے لیے احکام قرآن و سنت وغیرهما سے مستنبط کرکے امت کو بروقت روشنی دکھائی اور تقریباً ۱۱، ۱۲ صدیوں تک پورے عالم اسلام

میں ان کی جلائی ہوئی شمع بلکہ روشن کیے ہوئے مناروں کی روشنی ہی میں ہی حکمرانی و جہاں بانی کی گئی آپ حضرات امام ابو حنیفہ کے استنباط وہ مسائل کی تعداد کے ذکر میں یہ صراحت فرما ہی چکے ہیں کہ معاملات سے متعلق احکام کی تعداد عبادات والے احکام سے کچھ زیادہ ہے، چنانچہ کم و بیش ایسا ہی فرق فقہاء و علماء کی تصنیفات و فتاویٰ میں ملے گا. دور کیوں جائیے! فقہ حنفی کی سب سے مشہور و متداول کتاب جو اپنے زمانہ تصنیف سے لیکر آج تک برابر تقریباً یکساں طور پر اہمیت کی حامل رہی ہے اور آج بھی ہے، یعنی ''ہدایہ''. اس کی چار جلدوں میں صرف ایک پہلی جلد (جو بقیہ جلدوں کے مقابلہ میں نسبتہً مختصر ہے) عبادات سے متعلق احکام پر مشتمل ہے، بقیہ تین جلدیں ان احکام سے متعلق ہیں جنہیں آجکل کی عام بول چال میں ''دنیاوی احکام'' کہا جاتا ہے، جن میں حالت امن کے ہی نہیں حالت جنگ کے احکام و قوانین بھی (''کتاب السیر'' کے عنوان سے) ملتے ہیں، اور ان احکام و قوانین میں وہ بھی داخل ہیں جن کے لیے آجکل ''سول'' (CIVIL) اور ''ریوینیو'' (REVENUE) وغیرہ اصطلاحیں رائج ہیں اور وہ بھی جنھیں ''تعزیرات'' اور ''کریمنل'' (CRIMINAL) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے. چنانچہ امام ابو یوسف کی ''کتاب الخراج'' تمام مالیاتی مسائل پر مشتمل ہے جو دور اسلامی میں حکومتوں کے لیے راہ نما بنی رہی. یہ کتابیں خاص طور سے کتب فتاوی اپنے اپنے زمانہ ہائے تصنیف و افتاء کی گویا سماجی اور معاشرتی تاریخ بلکہ آئنہ بھی قدرتہً بن گئی ہیں کہ ان کے اندر ان زمانوں کی تمدنی، معاشرتی اخلاقی و تہذیبی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں بلکہ ان ادوار کو پڑھا جا سکتا ہے. طوالت کا خوف مانع نہ ہوتا تو اس کی مثالیں پیش کرکے مزید حکمت و بصیرت کا ہی نہیں دلچسپی کا بھی سامان فراہم کیا جاتا. یہاں یہ تاریخی حقیقت بھی سامنے رہنی چاہیے کہ ان فقہاء کے اخلاص، تقویٰ، خیر خواہی اور علم کوشی نے انہیں وہ اخلاقی طاقت بخش دی تھی کہ اس کے مقابلہ میں حکومت و شوکت کی طاقت بھی ہیچ نظر آتی تھی. تاریخ نے بارہا یہ مناظر دیکھے اور پیش کیے ہیں کہ جب کبھی [illegible]

ہوا تو اخلاقی قوت ہی کو فتح حاصل ہوئی اور حکومت کی طاقت سرنگوں ہوئی، یعنی فقہاء کے بتائے ہوئے احکام ہی سکہ رائج الوقت بنے، اور حکومتوں کے دئیے ہوئے احکام (ان کے مقابلہ میں) کھوٹے سکہ سے زیادہ قیمت نہ پا سکے۔ بلکہ چشم فلک نے یہ منظر بھی صدیوں دیکھا کہ زندہ و طاقتور حکومتوں کے مقرر کردہ حکام بھی جب تک ان بوریہ نشین مگر اخلاص و تقوی' اور تفقہ کے تخت پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے خواہ ان کی وفات ہی کیوں نہ ہو چکی ہو۔ اقوال کا سہارا لیکر فیصلہ نہ کرتے یا، بالفاظ دیگر حکم نہ دیتے اس وقت تک اس حکم کی حیثیت و قیمت پر پشہ سے زیادہ نہ ہوتی۔ اس کی تفصیل حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''حجۃ اللہ'' (ص ۱۵۳ ج ۱) کے باب "حکایۃ حال الناس قبل المائۃ الرابعۃ و بعدھا" میں بیان کی ہے اور یہ کوئی ایسا راز نہیں جسے بارھویں صدی میں شاہ ولی اللہ نے افشاء کیا ہو بلکہ یہ ایک برافگندہ حقیقت ہے جس سے ہر باخبر واقف ہے۔ آخر میں فقہ کی معتبر کتاب سے ایک ایسا اقتباس پیش کرنا مناسب لگ رہا ہے جس سے فقہ و فقیہ کے دائرہ کی وسعت کا اندازہ ایک ہی نظر میں کر لینا آسان ہوگا۔ اس طرح گویا "مسک الختام" کا مصداق ہو جائیگا۔ اس اقتباس میں ان کھوٹوں کی یا یوں کہیہ لیجیے کہ علم کے ان شعبوں کی تفصیل دی گئی ہے جو مسلمانوں کے لیے فرض کفایہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس فہرست سے پہلے یہ بھی ملتا ہے کہ جس علم میں بھی کسی نا گزیر خیر کا پہلو ہو ایسا ہر علم فرض کفایہ کا درجہ رکھتا ہے:

أما فرض الكفاية من العلم فهو كل علم لايستغنى عنه في قوام أمور الدنيا كالطب و الحساب....واللغة....و قسمة الوصايا و المواريث و الكتابة و كذا علم الآثار وللأخبار والعلم با لرجال و أصول الصناعات و الفلاحة كالحياكة و السياسة والحجامة الخ

اس جگہ یہ عبارت ایک ایسی کتاب (ردالمختار) سے نقل کی گئی ہے جسے اپنے زمانۂ تصنیف یعنی ڈیڑھ صدی سے زیادہ مدت سے فقہ و فتاوی' کے مرجع گویا سکہ رائج الوقت ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔ آج کے تمام حنفی مفتی بالعموم اس سے فتاوے دیتے ہیں،

اگرچہ یہ کلام سات سو سال قدیم ایک اور مستند فقیہ (فخرالدین زیلعی، متوفی : ۷۴۳ھ) کا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ جس طرح نماز جنازہ اور جہاد، جیسے خالص عبادتی احکام فرض کفایہ ہیں اسی طرح ان علوم و فنون کا سیکھنا (پھر انہیں برتنا) بھی فرض کفایہ ہے جس کا اس فہرست میں ذکر آیا ہے۔ اب اس فہرست پر نظر ڈالیے اور غور فرمایئے کہ کیا اصولاً ایسا کوئی علم چھوٹا ہے جسے آج کل "علوم دنیا" کی فہرست میں رکھا جاتا ہے! سرجری، طب، حساب، لغت، کتابت، علم الآثار (جس کی ایک تشریح "آرکیولوجی" [ARCHAEOLOGY] ہو سکتی ہے) تاریخ، سوانح ان کے علاوہ مختلف دستکاریاں، صنعتیں اور پیشے مثلاً کھیتی باڑی، کپڑا سازی حتیٰ کہ "حجامت" بھی اس فہرست میں شامل ہے، جب یہ علوم و فنون، دستکاریاں اور پیشے فرض کفایہ ٹھہرے تو پھر ان سے متعلق احکام سے شریعت اسلامیہ کیونکر خالی ہو سکتی ہے! اور یہ "خانہ" شریعت کی روشنی کے اجالے سے کیسے محروم رہ سکتا ہے؟

ایک بار پھر آخر میں آپ سب حضرات کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ایسا خشک، علمی اور تاریخی طویل مقالہ سننے کے لیے اپنا قیمتی وقت صرف کیا، اور ایک مسافر کی دلجوئی کے ساتھ علم دوستی کا ثبوت بھی پیش فرمایا۔ فجزاکم اللہ احسن الجزاء و السلام۔

English Publication
of
The Institute of Islamic Studies
Aligarh Muslim University, Aligarh

Post-Revolution Persian Verse by Munibur Rahman	Rs. 30.00
The United States and the Arab World by M. Shafi Agwani	Rs. 27.00
Whither North Africa by Nicoola A. Ziadeh	Rs. 15.00
Arab Geography by S. Muzaffar Ali	Rs. 25.00
Islamic Sciences by Mahmud Hasan Qaiser	Rs. 7.00
Types of Islamic Thought by Sabih A. Kamali	Rs. 30.00
The Arab League by M. Iqbal Ansari	Rs. 30.00
A Versified Treatise on Mysticism of Zahir-ud Din Muhammad Babur or the Risale-i Walidiyye Tr jimed by N. Akmal Ayyubi	Rs. 10.00
Muhammad Abduh by Muhmudul Haq	Rs. 30.00
Religion by Ahmad Ashfaq & Ahmad Saeed Khan	Rs. 15.00
Al-Mas'udi Millenary Celebration Volume by S. Maqbul Ahmad & A. Rahman	Rs. 30.00
Arab Geographical Thought by S. M. Ali	Rs. 35.00
Life and Works of Ziya Gokalp by Syed Sibtey Hasan	Rs. 30.00
Life and Thoughts of Muhammad Abd al-Wahhab by Sayyid Ahsan	Rs. 40.00
Some Aspects of Islamic-Turkish Culture by N. Akmal Ayyubi	Rs. 35.00

All orders must be addressed to :

PUBLICATIONS DIVISION
Aligarh Muslim University
ALIGARH-202002 INDIA

تفسیر قرآن مجید

کبیر احمد جائسی*

قدیم ترین فارسی تفسیروں میں وہ تفسیر بھی شامل ہے جس کا
واحد مخطوطہ کیمبرج یونیورسٹی کے کتابخانے میں محفوظ ہونے کی
وجہ سے علمی حلقوں میں تفسیر کیمبرج کے نام سے معروف ہے ۔

اس مخطوطہ کی کوئی ادھوری ، جزوی یا مکمل نقل دنیا کے
کسی اور کتابخانے میں موجود نہیں ہے ۔ اب تک کی تحقیقات
سے اس بات کا بھی پتہ نہیں چل سکا کہ یہ مخطوطہ اپنے وطن اصلی
سے نکل کر کب اور کس طرح برطانیہ پہونچا اور اب سے
تقریباً پونے دو سو سال پہلے ایک برطانوی کے ذاتی کتابخانے کی
زینت بنا جس کا نام اوپینوس تھا ۔ جب تک یہ مخطوطہ اس کے
ذاتی کتابخانے میں محفوظ رہا دنیا کو اس کے وجود کا علم
نہ ہوسکا مگر جب اس کے مرنے کے بعد اس کی وصیت کے
مطابق اس کا ذاتی کتابخانہ کیمبرج یونیورسٹی منتقل کیا گیا
تو بعض یوروپی فاضلین کی اس پر نظر پڑی اور انہوں نے اپنی اپنی
وسعت فکر و نظر کے مطابق یوروپ کی علمی دنیا سے اس مخطوطے
کا تعارف کرایا ۔ مشرقی دنیا میں اس کو عام کرنے کا شرف
ایک ایرانی فاضل آقائے جلال متینی کو حاصل ہوا جن کی نظر قدیم
فارسی متون بالخصوص چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کے فارسی متون
پر بڑی گہری ہے ۔ صاحب موصوف نے اس مخطوطے کو عالمانہ
دقت نظری کے ساتھ مرتب کر کے بنیاد فرہنگ ایران ، تہران کی
طرف سے بہار ۱۳۵۹ ھ ش میں شایع کروایا ۔ اس متن کو مرتب
کرنے میں ان کو کتنی دیدہ ریزی کرنی پڑی ہوگی اس کا اندازہ
صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے کسی قدیم فارسی متن

* پروفیسر کبیر احمد جائسی ، سابق صدر و ڈائرکٹر ، شعبۂ و
ادارۂ علوم اسلامیہ ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ

بالخصوص ایک ایسے مخطوطے کا ناقدانہ متن مرتب کیا ہو جس کا صرف ایک ہی نسخہ دنیا میں محفوظ ہو۔

ڈاکٹر جلال متینی نے اپنے طویل عالمانہ مقدمہ میں اس مخطوطے کی اسلائی خصوصیات، جملوں کی ساخت، افعال و ضمائر کے استعمال، نادر الفاظ و تراکیب وغیرہ کا جو تحلیلی تجزیہ کیا ہے وہ فارسی ادبیات میں قدر اول کی اہمیت کا حامل ہے اور اس بات کی نشاندھی کرتا ہے کہ فارسی ادبیات کی پیشرفت میں مذھبی طبقہ بالخصوص علماء کا کتنا زبردست ھاتھ رھا ہے اور انھی کی سعی و کوشش سے فارسی ادبیات کے دامن میں نہ صرف نئے نئے الفاظ داخل ھوئے بلکہ نئے نئے خیالات و تصورات نے جنم لیا اور فارسی ادبیات کے سمت سفر کو بدل کر رکھ دیا۔

ڈاکٹر جلال متینی کا خیال ہے کہ اصل تفسیر چار جلدوں میں تھی جن میں سے جلد اول و دوم مفقود ھوگئی اور جلد سوم و چہارم دستبرد زمانہ سے محفوظ رہیں، نہ تو اس تفسیر کے مفسر کا نام معلوم ہے اور نہ ھی اس کا زمانۂ تحریر لیکن خوش قسمتی سے اس تفسیر کے مخطوطے میں ترقیمہ محفوظ ہے جس سے اس بات کا علم ھوتا ہے کہ اس کی کتابت کا کام محمد بن ابی الفتح الفقیہ الغریب کے ھاتھوں ھوئی ہے اور انھوں نے اس مخطوطے کی کتابت کا کام ۸ ربیع الاخر ۶۲۸ھ کو مکمل کیا تھا۔ اس ترقیمے سے غلط فہمی نہ ھونی چاھیے کہ یہ تفسیر ساتویں صدی ھجری میں معرض وجود میں آئی تھی۔ قدیم فارسی متون پر نظر رکھنے والے تقریباً تمام محققین اس بات پر متفق ہیں کہ اس تفسیر کا زمانۂ تصنیف چوتھی صدی ھجری یا حد سے حد پانچویں صدی ھجری کے اوائل کا زمانہ ہے۔ ڈاکٹر جلال متینی کی تحقیق بھی یہی ہے کہ اس کا زمانۂ تصنیف پانچویں صدی ھجری کے نصف اول کے بعد کا زمانہ نہیں ھو سکتا۔

علاوہ ازیں ڈاکٹر جلال متینی نے اس نامعلوم مفسر کے استعمال کردہ بعض الفاظ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس تفسیر کا

مفسر خراسانی رہا ہوگا۔ مزید برآں انہوں نے کچھ ایسے الفاظ کی بھی نشاندہی کی ہے جو آج بھی خراسان کے مختلف علاقوں میں سمجھے اور بولے جاتے ہیں۔ انہوں نے مثالیں دیتے ہوئے لکھا ہے کہ بی افتادن بہ معنی بی بردن (تلاش کرنا، منکشف کرنا، داخل ہونا)، شلنہ بہ معنی کرپاسہ یا چلپاسہ (زہریلی چھپکلی کی ایک قسم)، گزدم بہ معنی کثردم (بچھو) ایسے الفاظ ہیں جو آج بھی خراسانیوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔

جہاں تک اس مفسر کے مسلک کا سوال ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ سنی تھا البتہ اس کی تحریر سے یہ بات واضح نہیں ہے کہ اس کا تعلق کس فقہی مسلک سے تھا؟ اس عمیق مطالعے سے ڈاکٹر جلال متینی نے اس بات کی بھی نشاندھی کی ہے کہ اس تفسیر کا مفسر عقیدۂ تجسیم کا بھی قایل نہیں تھا، انہوں نے اپنی بات کو مثالوں کے ذریعے واضح کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ مفسر مذکور نے ثم استوی' علی العرش الرحمٰن کی تفسیر لکھتے ہوئے استوی' کی تشریح سے اجتناب کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کے جو معنی ہوتے ہیں ان کا اطلاق اللہ تعالی' کی صفات پر کرنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح اولم یروا انا خلقنا لھم مما عملت ایدینا انعاما، کی تفسیر لکھتے ہوئے 'ایدی' کا فارسی ترجمہ تو بتلا دیا ہے اور لکھا ہے کہ اللہ نے یہ لفظ لوگوں کے سمجھنے کے لیے بیان فرمایا ہے ورنہ اللہ کی ذات ھاتھ پاؤں سے منزہ ہے! اسی طرح قال یا ابلیس ما منعک ان تسجد لما خلقت بیدی استکبرت...کی تفسیر لکھتے ہوئے جب وہ "ید" کے لفظ پر پہونچتا ہے تو لکھتا ہے کہ اس کا فارسی ترجمہ مناسب نہیں ہے، اس کی وجہ وہ یہ بتلاتا ہے کہ ہم کو اس کا علم نہیں ہے کہ "ید" کیا ہے؟ ہم کو صرف اس کا علم ہے کہ یہ تخلیق آدم کی ایک خصوصیت ہے اسی سلسلۂ سخن میں اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس بارے میں اس سے زیادہ غور خوض نہ کرنا چاھیے اور تشبیہ کا مرتکب نہ ہونا چاھیے۔ علاوہ بریں ڈاکٹر جلال متینی نے داخلی شہادتوں سے اپنی اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ زیر نظر مفسر قدریوں کے گروہ سے بھی متعلق نہیں تھا۔

اس تفسیر کی زبان انتہائی شستہ و رفتہ ہے اور اس میں عربی کلمات و فقرات و اقوال کا استعمال دوسری تفسیروں کے مقابلے میں کم ہوا ہے۔ علاوہ برایں چند مقامات کو چھوڑ کر مفسر نے طول و طویل قصص و روایات کو نقل کر کے اپنی تفسیر کو ''دلچسپ'' بنانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اس مخطوطے کی زبان اور املائی خصوصیات پر ڈاکٹر جلال متینی نے اپنے مقدمہ میں جو کچھ تحریر کیا ہے وہ تحقیق کا اعلیٰ نمونہ ہے لیکن ہم اس سے صرف نظر کرتے ہوئے اس کے متن کی طرف رجوع کریں گے تاکہ اس تفسیر کے متن کے بارے میں ہم کو کچھ علم ہو سکے۔

قبل اس کے کہ ہم اصل متن کا مطالعہ پیش کریں اس مقام پر ہم ایک اور ایرانی فاضل ڈاکٹر یحییٰ مہدوی کا ایک طویل اقتباس نقل کرنا مناسب سمجھتے ہیں جس میں انھوں نے اس تفسیر کے بارے میں بعض نئے نکات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انہوں نے مذکورہ تفسیر کے بارے میں تحریر کیا ہے:

''نسخۂ تفسیر محفوظ در کتابخانۂ کیمبرج (صفحات ۱۳-۳۷ فہرست) کہ تاریخ کتابت آن ۶۲۸ ہجری است و فقط شامل نیمۂ دوم قرآن (از آیۂ ۳ از سورۂ مریم ۱۹ تا آخر قرآن با افتادگیہای درمیان). درین نسخہ آیات جزء بعد جزء ابتدا ترجمہ و بعد تفسیر شدہ است و قصص چندان مفصل نیست. ادوارد براون در شمارۂ جولائی ۱۸۹۴ء روز نامۂ انجمن ھمایونی آسیای (صفحات ۴۱۷ تا ۵۲۴) طی مقالۂ مفصل این نسخہ را معرفی و خصوصیات لغوی و املائی آنرا یاد داشت و مقداری از لغات و اصطلاحات و قصص آنرا نقل کردہ است. از این خصوصیات و ترجمہ تعبیری کہ از بعضی از لغات عربی بفارسی شدہ است و این کہ رجال تفسیر و حدیثی کہ نام آنہا درین نسخہ آمدہ و شناختہ شدہ اند پیش از ۲۵۸ ہجری می زیستہ اند ادوارد براون چنین استنباط و استنتاج کردہ است کہ تاریخ تصنیف این تفسیر نباید موخر بر تنظیم شاہ المد و حدود ۳۰۰ ہجری باشد''۔

[کتابخانۂ کیمبرج میں محفوظ تفسیر کا وہ نسخہ (صفحات ۱۲-۳۷ فہرست) جس کی تاریخ کتابت ۶۲۸ ہجری ہے اور صرف قرآن کے نصف دوم (سورۂ مریم کی تیسری آیت سے لے کر آخر قرآن تک (مگر) درمیان میں کئی جگہوں پر صفحات نہیں ہیں) پر مشتمل ہے ۔ اس نسخے میں قرآن کے ایک ایک جزو کا پہلے ترجمہ بعد ازاں تفسیر ہے اور قصص تفصیل سے نہیں لکھے گئے ہیں ۔ ایڈورڈ براؤن نے جولائی ۱۸۹۴ء کے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے مجلہ میں ایک مفصل مقالہ کے ذریعے اس نسخہ کا تعارف کرایا ہے اور اس کے کچھ الفاظ ، اصطلاحات اور قصص بھی نقل کیئے ہیں ۔ ان خصوصیات اور عربی الفاظ کے فارسی ترجموں اور ان کی تعبیروں کے ذریعے اور ان محدثین و مفسرین کے ناموں کے ذریعے جن کا ذکر اس تفسیر میں ہوا ہے اور جو ۲۵۸ھ سے قبل حیات تھے ، ایڈورڈ براؤن نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس تفسیر کی تصنیف شاہ نامہ کے نظم[1] ہونے اور ۴۰۰ھ کے بعد کے زمانے میں نہ ہونی چاہیے (یعنی تقریباً اسی زمانے میں ہونی چاہیے جب شاہ نامہ نظم ہوا تھا)] .

" به نظرمی رسد که تنها به استناد به خصوصیات زبانی و استعمال لغات قدیمی بی آنکه قدمت خط و کاغذ نسخه هم موید باشد نمی توان میان نوشته های دورۂ نزدیک هم مثل اواخر قرن چهارم باقرن پنجم بنحو قطعی امتیاز گذاشت بخصوص که نسخ آثار منثور قرن چهارم و پنجم آنچه باقی مانده است اغلب در قرن ششم و بعد کتابت شده است و معلوم نیست که کاتبان تاچه اندازه در نقل تمام خصوصیات آنچه از آن نسخه برمی داشته‌اند رعایت امانت داری را کرده اند و تاچه حدودی گفتۂ دیگران را بزبان و لهجه خود در نیاورده‌اند بدین قرار نثری که ما بعنوان قرن چهارم و پنجم تلقی می کنیم اصالت آن چندان متیقن نیست تا ملاک مقایسه و حکم قرار گیرد . بعلاوه محتمل نیز هست که این گونه خصوصیات در نتیجۂ اوضاع و احوالی دریک منطقه و

---

(۱) شاہ نامۂ فردوسی لگ بھگ ۴۰۰ھ میں تکمیل کو پہونچا تھا

حتی محل کوچکی از سر زمین فارسی زبانان محفوظ مانده و در مناطق و محلهای دیگر یک دو قرن از میان رفته باشد۱»۔

[ایسا خیال ہوتا ہے کہ صرف زبان کی خصوصیات اور قدیم الفاظ کے استعمال سے نزدیکی ادوار مثلاً چوتھی صدی ہجری کے اواخر اور پانچویں صدی کی تحریروں کے درمیان قطعی طور پر امتیاز نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ ان تحریروں کے خط کی قدامت اور مخطوطہ کا کاغذ بھی اس کی تائید نہ کرے۔ خاص طور سے اس لیے کہ چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کے جو نثری آثار باقی رہ گئے ہیں زیادہ تر ان کی کتابت چھٹی صدی ہجری اور اس کے بعد ہوتی ہے اور (ہم کو) اس بات کا علم نہیں ہے کہ کاتبوں نے اصل نسخہ کی خصوصیات کو نقل کرنے میں کسی حد تک دیانت داری کا مظاہرہ کیا ہے، اور کس حد تک دوسرے لوگوں کی کہی ہوئی باتوں کو اپنی زبان اور بول میں نہیں لکھا ہے؟ اس وجہ سے وہ نثر جس کو ہم چوتھی اور پانچویں صدی کی نثر قرار دیتے ہیں جب تک ان کو موازنہ و مقابلہ کی کسوٹی پر کس نہ لیا جائے ان کا کھرا پن چندان متعین نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ اس طرح کی خصوصیات وضع (زمانہ) اور حالات کی وجہ سے ایک منطقہ بلکہ فارسی زبان بولنے والوں کے ایک چھوٹے سے مقام میں محفوظ رہ گئی ہوں اور دوسری جگہوں میں ایک دو صدی پہلے ہی متروک ہو چکی ہوں۔]

ڈاکٹر یحیٰی مہدوی نے اپنی تحریر کے دوسرے پیراگراف میں جن امور کی طرف اشارہ کیا ہے وہ خاصے اہم ہیں، خاص طور سے ان کی یہ بات کہ فارسی زبان بولنے والوں کے ایک چھوٹے سے علاقے میں جو زبان محفوظ رہ گئی ہو ضروری نہیں کہ وہ فارسی

(۱) مجلہ دانشکدۂ ادبیات، تہران، سال سیزدھم، شمارۂ چہارم (تیر ماہ ۱۳۴۵ ہ ش) ص ۱۹۱۔

زبان بولنے والوں کے تمام خطوں میں محفوظ ہو ۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر یہ بھی تو نہیں کیا جا سکتا کہ کسی مخطوطے کے صرف سنہ کتابت ہی کو سند مان کر اسی کو اس کا زمانۂ تصنیف قرار دے دیا جائے کیونکہ صدیوں تک ایک مخطوطے سے اس کی متعدد نقلیں تیار ہوتی رہی ہیں اور یہ بھی یقینی ہوا ہے کہ کاتبوں نے مقامی اور زمانی اثرات کے تحت اصل مخطوطے کے بعض بعض کلمات و فقرات میں تبدیلی کردی ہے ۔ ان تمام وقوعات کے بعد بھی ہمارے لیے چارۂ کار صرف یہی رہتا ہے کہ کسی مخطوطے کے زمانۂ تصنیف کو طے کرنے کے لیے ہم داخلی شہادتوں کے ساتھ ساتھ اس کی زبان اور طرز املا کو بھی وسیلۂ کار بنائیں ۔

زیر نظر تفسیر کے مخطوطے کی کتابت اگرچہ ۶۲۸ھ میں ہوئی ہے مگر اس کا زمانۂ تصنیف ساتویں صدی ہجری نہیں قرار دیا جا سکتا ، اس کی وجہ یہ ہے کہ ساتویں صدی ہجری کے نثری آثار نسبتاً زیادہ تعداد میں محفوظ ہیں اور ان کے انداز بیان و زبان اور زیر نظر تفسیر کے انداز بیان و زبان میں نمایاں فرق ہے ۔ زیر نظر تفسیر کا انداز بیان اور زبان تقریباً وہی ہے جو چوتھی صدی ہجری کے نثری آثار کی ہے اسی لیے ڈاکٹر جلال متینی اور فارسی زبان کے دوسرے محققوں نے اس تفسیر کا زمانۂ تحریر چوتھی صدی ہجری یا زیادہ سے زیادہ پانچویں صدی ہجری کے اوائل کا زمانہ قرار دیا ہے ۔ جب تک کوئی داخلی یا خارجی شہادت اس بات کے خلاف نہ مل جائے ہم مجبور ہیں کہ مذکورہ محققوں کی ہم نوائی کرتے ہوئے اس کو چوتھی صدی ہجری یا پانچویں صدی ہجری کے اوائل کی تصنیف قرار دیں ۔

گذشتہ سطور میں عرض کیا جا چکا ہے کہ زیر نظر تفسیر میں قصص و روایات کا عنصر دوسری تفسیروں کے مقابلے میں نسبتاً کم ہے لیکن جہاں جہاں اس مفسر نے قصص و روایات کا سہارا لیا ہے وہاں وہاں وہ دوسرے مفسرین ہی کی صف میں کھڑا نظر آتا ہے مثلاً اس تفسیر کے نا معلوم مفسر نے سورۂ ق کی پہلی آیت کی تفسیر

کرتے ہوئے عبداللہ ابن عباس سے منقول دو روایتوں کا حوالہ دے کر یہ تحریر کیا ہے کہ "قاف" ایک سبز رنگ کا پہاڑ ہے جو اس دنیا کے چاروں طرف تہہ بہ تہہ پھیلا ہوا ہے، آسمان کی سبزی اسی پہاڑ کی وجہ سے ہے اور خداوند تعالی نے اس سورۃ میں اسی پہاڑ کی قسم کھائی ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ قاف اسمائے الہی میں سے ایک اسم ہے جس کی قسم اللہ تعالی نے کھائی ہے۔ بقول زیر نظر مفسر، قتادہ کے نزدیک "قاف" قرآن کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ ضحاک بھی حضرت عبداللہ ابن عباس ہی کی طرح "قاف" کو ایک سبز مگر زمرد کا پہاڑ قرار دیتے ہیں جو زمین کے ارد گرد تہہ بہ تہہ پھیلا ہوا ہے۔ دنیا کے اندر کوئی ایسا خطہ یا قریہ نہیں ہے جہاں اس پہاڑ کی رگ پیوست نہ ہو۔ اللہ تعالی نے ایک فرشتے کو اس پہاڑ کا موکل مقرر کیا ہے جو اس پہاڑ پر اپنا ہاتھ رکھے ہوئے ہے جب اللہ تعالی کا منشا یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کے کسی گروہ کو ہلاک کرے تو اللہ اس فرشتے پر وحی نازل کرتا ہے کہ وہ اس پہاڑ کی "رگ" کو جنبش دے تاکہ لوگ اس کی جنبش سے زمین کے اندر سما جائیں۔ زیر نظر مفسر نے مقاتل کا حوالہ دیتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ ان کے نزدیک بھی "قاف" سبز زمرد کا پہاڑ ہے جو دنیا کے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے اور آسمان کی سبزی اسی پہاڑ کی وجہ سے ہے۔ اس پہاڑ کے اس طرف (عالم بالا) کا پردہ ہے جو ایک سالہ راہ پر واقع ہے۔ پردے اور اس کوہ "قاف" کے درمیان تاریکی ہے۔ سورج پردے کے اس طرف غروب ہوتا ہے اور اس کوہ "قاف" سے طلوع ہوتا ہے۔ خدا نے اسی پہاڑ کی قسم کھائی ہے[1]۔

درج بالا عبارت سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایسے مقامات پر اس نا معلوم مفسر نے اپنی رائے دینے سے احتراز کیا ہے، اس کے سامنے جو بھی تفسیری ذخیرہ تھا اس سے اس نے

(۱) ج ۲، ۳۶۰-۳۶۱۔

بھرپور استفادہ کرتے ہوئے ان سارے مفسروں کی روایتوں کا حوالہ دے دیا ہے جن تک اس کی رسائی ہو سکی ہے۔

فارسی زبان کے اساطیری ادبیات میں کوہ قاف کا افسانہ بہت مشہور ہے اور اس کی پریوں کے قصے زبان زد عوام و خواص ہیں۔ عطار نیشاپوری نے اپنی مشہور ترین کتاب 'منطق الطیر' میں کوہ قاف کو سیمرغ کا مسکن قرار دیا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ "ق" کو ایرانیوں نے کوہ قاف کے مترادف سمجھ لیا ہو؟ اس مقام پر سب سے اہم سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا واقعی حضرت عبداللہ ابن عباس نے "ق" کو کوہ قاف قرار دیا ہے یا زیر نظر مفسر کسی جعلی روایت کا شکار ہو کر حضرت عبداللہ ابن عباس سے روایت منسوب کر گیا ہو بظاہر یہ بات ممکن نظر نہیں آتی کہ حضرت عبداللہ ابن عباس "ق" کو کوہ قاف بھی قرار دیں اور اسمائے الٰہی میں سے ایک اسم بھی۔

اسی طرح کا ایک نمونہ سورۂ نجم کی ابتدا میں بھی ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہی مفسر والنجم اذا ھویٰ (قسم ہے [مطلق] ستارے کی جب وہ غروب ہونے لگے[۱]) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ان آیات میں اللہ نے ان "نجوم قرآن" کی قسم کھائی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وقتاً فوقتاً بیس سال سے زاید عرصے تک ایک ایک، دو دو، تین تین کر کے نازل ہوتی رہی تھیں۔

اس مفسر کے قول کے مطابق جب سورۂ نجم کی یہ آیت نازل ہوئی اور اس کی خبر عتبہ بن ابی لہب کو ہوئی تو اس نے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بتلا دیا جائے کہ وہ "نجوم قرآن" کا منکر ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عتبہ کی اس بات کی خبر ہوئی تو آپ نے دعا فرمائی اللھم سلط علیہ سبعا من سباعک (اے اللہ درندوں میں سے ایک درندہ اس پر مسلط

(۱) ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی ص، ۹۳۲

کر دے) جب عتبہ کو اس دعا کی خبر ہوئی تو وہ بہت خوف زدہ ہوا، اس کے بعد سے وہ کسی جگہ بھی تنہا نہ جاتا کہ مبادا کوئی درندہ اس کو چیڑ پھاڑ نہ ڈالے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے کچھ ہی عرصے بعد عتبہ بن ابی لہب ایک کاروان کے ساتھ سفر پر نکلا جب کاروان نے حران کے نزدیک پڑاؤ ڈالا تو وہ شب بسری کے لیے سب لوگوں کے درمیان سو گیا۔ اللہ کے حکم سے ایک شیر آیا اور اس نے لوگوں کے درمیان سے عتبہ کو اٹھا لیا اور تھوڑی دور لے جا کر اس کی ہڈی پسلی توڑ کر اس کو ہلاک کر ڈالا۔ شیر نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے مگر اس کی پلیدی اور ملعونی کے سبب اس کے گوشت کو کھانا گوارا نہ کیا۔ شیر کے اس عمل سے لوگوں پر یہ بات واضح ہو گئی کہ شیر عتبہ کو کھانے کے لیے نہیں اٹھا لے گیا تھا بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی وجہ سے لے گیا تھا۔

اسی سلسلۂ سخن میں اس مفسر نے ایک دوسری روایت نقل کی ہے۔ اس روایت میں 'نجم' کو اس کے لغوی معنوں میں لیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے غروب ہوتے ہوئے ستارے کی قسم کھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قسم کھانے کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ مکہ کے کفار کہا کرتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس قرآن کو خود وضع کرتے ہیں اسی کے جواب میں خدا نے یہ قسم کھائی اور فرمایا "اس خدا کی قسم جو رات کو ستاروں کو نکالتا ہے اور دن کو پوشیدہ کر دیتا ہے۱۔"

اللہ تعالیٰ نے کلام پاک میں کئی اور مقامات پر مظاہر فطرت کی قسم کھائی ہے۔ یہ بات عقل انسانی کی گرفت سے باہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مظاہر فطرت کی قسم کیوں کھائی ہے اس لیے کلامِ پاک کی تفسیر لکھتے ہوئے مفسروں کو اعتراف عجز کے طور پر صرف اتنا لکھنا چاہیے تھا کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے فلاں

(۱) یہ کلام پاک کی آیت کا نہیں بلکہ مفسر کی فارسی تحریر کا ترجمہ ہے۔

چیز کی قسم کھائی ہے مگر ایسا نہیں ہوا۔ ابتدائی صدیوں ہی سے تقریباً ہر مفسر نے اپنی اپنی فہم و عقل کے مطابق اس کی توجیہہ و تشریح و تحلیل کی کوشش کی جس کا لازمی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ہمارے تفسیری ذخیرے میں بہت سی ایسی روایتیں داخل ہو گئیں جن کی اصل انتہائی مشکوک ہے اور جن کے وجود نے بیشتر قاریوں کے ذہن و دماغ کو پراگندہ کیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس طرح کی تمام بے اصل روایتوں کی نشاندہی کر کے ان کے بارے میں واضح الفاظ میں یہ بتلا دیا جائے کہ یہ افسانۂ محض ہیں اور ان کا روح قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

سورۃ القمر کی پہلی آیت اقتربت الساعۃ و انشق القمر کا ترجمہ اس مفسر نے ان الفاظ میں کیا ہے: "رستخیز نزدیک آمد و ماہ شکافت (قیامت نزدیک آگئی اور چاند میں شگاف پڑ گیا)۔ یہ ترجمہ تحریر کرلے کے بعد مفسر نے اس آیت کی جو شان نزول تحریر کی ہے وہ خاصی طویل ہے ہم اس کی عبارت کا خلاصہ اپنی زبان میں تحریر کرتے ہیں۔

بقول مفسر ایک دن اطراف مکہ کا ایک بدو مکہ معظمہ میں آیا اور صدا لگائی کہ کون ہے جو مجھکو ان محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب (صلی اللہ علیہ وسلم) تک پہونچائے جن کو اللہ نے پیغامبر بنا کر بھیجا ہے۔ اس بدو کی آواز ابوجہل نے سنی تو اس کو بلا کر پوچھا کہ تم کس سے ملاقات کرنا چاہتے ہو؟ بدو نے اپنی بات دہرا دی تو ابوجہل نے پوچھا کہ تم ان سے مل کر کیا کروگے؟ بدو نے جواب دیا میں ان پر ایمان لاؤں گا اور جو مویشی اپنے ساتھ لایا ہوں وہ ان کو نذر کروں گا۔ بدو کی یہ بات سن کر ابوجہل نے کہا کہ اے بدو تو پاگل ہو گیا ہے میں تیرا علاج کروں گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔ بدو نے ابوجہل کو جواب دیا کہ میں پورے طایف میں اپنے سے زیادہ کسی کو عقلمند نہیں سمجھتا۔ ابوجہل نے سوال کیا پھر تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تلاش میں کیوں ہے؟ اس نے جواب دیا کہ کل رات ہم لوگ طایف میں بیٹھے ہوئے مصروف گفتگو تھے اچانک ہماری نظر آسمان

پر پڑی، دکھائی دیا کہ آسمان کھل گیا ہے اور اس میں سے سواروں کی ایک فوج اتر پڑی ہے جو زمین کی طرف آرہی ہے ہم لوگ اس کو تعجب سے دیکھ رہے تھے کہ ایک آواز آئی، "اے اهل طایف الهو اور مکه جاؤ وهاں الله نے اپنا ایک پیغمبر بھیجا ہے جن کا نام محمد بن عبدالله ہے وہ لوگ خوش قسمت ہیں جو ان پر ایمان لائیں اور ان پر افسوس جو ان کے منکر هوں". میں اسی آواز کو سن کر مسلمان هونے کے لیے آیا هوں اور یه کے سویشی ان کو نذر کرنا چاهتا هوں. ابوجهل نے اس سے کہا کہ هم نے بھی ایسے پیغمبر کے آنے کی بات سنی ہے مگر وہ اله تو ابھی آئے ہیں اور نه هی یه زمانه ان کے آنے کا ہے اس لیے تم یه سویشی میرے هاتھ فروخت کردو اور واپس جاؤ جب ان پیغمبر کا ظہور هوگا تو میں تم کو خبر کر دوں گا تو تم آجانا. بدو نے سویشی ابوجهل کے هاتھ فروخت کر دیے، ابوجهل نے نصف قیمت دی اور نصف کے لیے کہا کہ میں خود تم کو بھجوا دوں گا.

جب وہ بدو ابوجهل کے پاس سے واپس هوا تو مطمئن نہیں تھا اس کو شبه تھا کہ ابوالحکم (ابوجهل کی کنیت ہے) نے جو کچھ کہا ہے وہ درست نہیں ہے اس لیے اس نے دوبارہ آواز لگائی کہ کون ہے جو مجھکو محمد بن عبدالله (صلی الله علیه وسلم) تک پہونچائے؟ وہ بدو حضرت علی کے سامنے پڑا جو اس وقت کمسن تھے، حضرت علی نے کہا تم میرے ساتھ چلو میں تم کو وهاں تک پہونچا دوں گا. بدو نے پوچھا کہ کیا وہ ان پیغمبر کو جانتے ہیں؟ حضرت علی نے اپنا تعارف کرائے هوئے بتایا کہ وہ ان پیغمبر کے چچا زاد بھائی ہیں، بدو حضرت علی کی معیت میں حضور اکرم صلی الله علیه وسلم کے پاس پہونچا، اس وقت آپ کوہ صفا پر نماز میں مشغول تھے جب آپ نے نماز ختم کر لی تو بدو آپ کے پاس گیا اور پوچھا کہ آپ هی الله کے رسول ہیں رسول اکرم صلی الله علیه وسلم نے جواب دیا کہ هاں. اس نے درخواست کی کہ آپ اپنا دست مبارک آگے بڑھائیں تاکہ وہ بیعت کرکے مسلمان هو جائے. آپ نے اس کی درخواست قبول فرمائی

پھر بدو نے کلمۂ شہادت پڑھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے دعا فرمائی کہ اللہ اس کے ایمان کو قبول کرے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ تم کو سورے بارے میں کس طرح علم ہوا، اس نے طایف میں جو کچھ دیکھا تھا اور مکہ آکر ابوجہل سے جو کچھ سنا تھا اور جس طرح اپنے مویشی اس کے حوالے کیے تھے سب کچھ آپ کو بتلا دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس بدو کو لے کر ابوجہل کے گھر تشریف لے گیے تاکہ اس کے مویشی اس کو دلوادیں۔ ابوجہل کے گھر پہونچ کر بدو نے ابوالحکم کہہ کر آواز دی تو کوئی جواب نہ آیا اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بدو کو روک دیا اور ابوجہل کے نام سے اس کو پکارا تو اس نے فوراً جواب دیا اور گھر کے باہر آگیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس بدو کی بقیہ رقم دے دو۔ ابوجہل نے بے چون و چرا آپ کے ارشاد کی تعمیل کی۔ بعد ازآن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجہل کو مسلمان ہونے کی دعوت دی لیکن اس نے اس کو قبول نہیں کیا۔ آپ نے واپسی پر اعلان فرمایا کہ جس کو ابوجہل کی ذلت دیکھنی ہو آکر دیکھ لے۔

جب اہل مکہ کو اس واقعہ کی خبر ملی تو یہ ایک جگہ جمع ہو کر ایمان لانے کے بارے میں باہم مشورہ کرنے لگے۔ ان لوگوں کو ابوجہل سے اس بات کی شکایت تھی کہ وہ ان کو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اٹھنے بیٹھنے سے منع کرتا ہے مگر خود ان کے ارشاد کی تعمیل کرتا ہے۔ جب ابوجہل کو اس بات کی خبر ہوئی تو ان لوگوں کے پاس گیا اور اس نے کہا کہ وہ مجبور تھا جو کچھ بھی اس نے کیا مجبوری میں کیا، وہ لوگ اس کی بات سن لیں پھر جو چاہیں اس کے مطابق فیصلہ کریں۔

ابوجہل نے ان لوگوں کو بتلایا کہ جب وہ بدو اس کے پاس آرہا تھا تو اس نے محسوس کر لیا تھا کہ یہ (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی اس کے ساتھ ہیں اس لیے وہ ایک بڑا پتھر لے کر

کوٹھے پر چڑھ گیا تھا تاکہ جب محمد آئیں تو وہ اس پتھر سے ان کی زندگی کا خاتمہ کر دے جس وقت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کے دروازے پر اس کا نام لے کر پکارا اس وقت ان کو مارنے کے لیے اس نے پتھر ہاتھ میں اٹھا لیا لیکن نہ جانے کس طرح پتھر اس کے گلے کا ہار بن گیا اس نے ہر چند کوشش کی کہ وہ پتھر گردن سے باہر نکل آئے وہ ناکام رہا پھر اس نے خدا سے دعا کی کہ اگر وہ اس کو اس پتھر سے نجات دے دیتا ہے تو وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی "حاجت روائی" کر دے گا۔ اس دعا کا کرنا تھا کہ پتھر دو ٹکڑے ہو کر اس کی گردن سے گر گیا۔ پھر وہ گھر میں گھس کر ایسی جگہ بیٹھ گیا جہاں آپ کی آواز نہ سنی جا سکے۔ اس جگہ اس نے دیکھا کہ زمین سے اونٹ کی گردن کی طرح کی کوئی چیز ابھری، اس کی آنکھوں سے انگارے برس رہے تھے اس نے کہا اگر تو یہاں سے باہر جاکر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کام نہیں کرتا تو میں تجھکو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں گا۔ اس لیے وہ (ابوجہل) مجبور ہو کر باہر آیا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی فرمایش پوری کی حالانکہ وہ جانتا تھا کہ یہ جادو تھا۔ اس نے ان لوگوں سے کہا کہ تم لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہاں بلالو میں ایک ایسے کام کی فرمائش کروں گا جو دوسرے جادوگروں سے نہیں ہو سکتا اگر وہ میری فرمائش پوری کر دیتے ہیں تو تم پر ان کا جادوگر ہونا واضح ہو جائے گا۔

اس کے بعد تمام لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور آپ کو آواز دی آپ بلا توقف اپنے حجرے سے باہر آگئے اور ان لوگوں کے درمیان بیٹھ گئے۔ ابوجہل نے کہا کہ اس سے قبل آپ نے جو کچھ کیا تھا وہ جادو تھا، اب میں ایک بات آپ سے کہتا ہوں اگر آپ وہ کر دیں تو میں سمجھوں گا کہ آپ جادو گر نہیں ہیں اور جو کچھ بھی آپ کہتے ہیں وہ درست ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ کون سا کام ہے؟ ابوجہل نے جواب دیا آج چودھویں رات ہے آپ چاند کے

دو ٹکڑے کر دیجیے۔ آپ نے ابوجہل کو جواب دیا یہ تو اللہ کا کام ہے پیغمبر کا نہیں۔ اسی وقت حضرت جبریل آئے اور انہوں نے آپ کو اللہ کا پیام دیا کہ آپ مطمین رہیں یہ کام ہو جائے گا پھر آپ یہ معجزہ دکھانے پر راضی ہو گئے۔

ابوجہل نے اطراف مکہ میں منادی کرادی کہ جس کو یہ منظر دیکھنا ہو نصف شب تک آجائے۔ لوگ جوق در جوق جمع ہو گئے۔ جب نصف شب ہو گئی تو آپ نے دو رکعت نماز پڑھی اور سر بہ سجود ہو کر چاند کے دو ٹکڑے ہونے کی دعا کی، اسی وقت ایک آواز کے ساتھ چاند دو ٹکڑے ہو گیا، ایک ٹکڑا ادھر رہا ایک ادھر چلا گیا جو لوگ وہاں تھے سب اوندھے منہ گر کر بے ہوش ہو گئے، ان کے ہوش میں آنے سے پہلے ہی چاند اپنی اصلی حالت پر آگیا۔ جب وہ لوک ہوش میں آئے تو آپ کا نام لے کر کہنے لگے کہ آپ بہت بڑے جادوگر ہیں، اس سے قبل آپ نے زمین پر جادو دکھلایا تھا اب آسمان پر دکھلا دیا۔ ہم ہرگز آپ کے جادو پر ایمان نہ لائیں گے۔ اسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "ساعت (روز قیامت) نزدیک آگئی اور چاند شق ہو گیا"۔

جو لوگ اللہ اور رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور قرآن کے منزل من‌اللہ ہونے کے قایل ہیں ان کو اس بات میں کوئی شک، شبہ نہیں ہے کہ اللہ کے حکم سے ایک موقع پر چاند دو ٹکڑے ہو گیا تھا لیکن ہمارے مفسروں نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوے بہت سی سینہ بہ سینہ چلی آنے والی روایتوں کو بھی اپنی تحریروں میں شامل کر لیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک مفسر کا بیان دوسرے کے بیان سے کافی حد تک مختلف ہو گیا ہے۔ زیر نظر مفسر نے ابوجہل کو ایسی معجزے کا مطالبہ کرنے والا قرار دیا ہے۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ اس بات میں وہ منفرد نہیں ہے۔ اس مفسر کے صدیوں بعد جب شاہ عبدالقادر محدث دھلوی نے اپنی تفسیر تحریر فرمائی تو انہوں نے بھی ابوجہل کو شق‌القمر کا مطالبہ کرنے والا قرار دیا ہے۔ ان کا بیان "کہتے ہیں کہ" کے الفاظ سے شروع

ہوتا ہے اس لیے یہ تو معلوم کرنا دشوار ہے کہ ان کا ماخذ کیا ہے؟ ان کے بیان کا لب لباب یہ ہے کہ ایک رات ابوجہل اور ایک یہودی ساتھ کہیں جا رہے تھے راستے میں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مل گئے۔ ابوجہل نے آپ سے کوئی معجزہ دکھانے کی خواہش کی۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ وہ کس قسم کا معجزہ دیکھنا چاہتا ہے۔ ابوجہل سوچ میں پڑ گیا تو یہودی نے کہا کہ ان سے کہو یہ چاند کے دو ٹکڑے کردیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چاند کی طرف انگشت شہادت سے اشارہ فرمایا اور چاند دو ٹکڑے ہو گیا اور دونوں ٹکڑے ایک دوسرے سے دور ہو گئے پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا چاند پہلی جیسی حالت میں آگیا۔ ابوجہل نے کہا آپ نے جادو کرکے ہماری آنکھوں کو باندھا اس لیے ہم کو چاند اس طرح نظر آیا اس کے بعد ایک قافلہ دور سے آیا ابوجہل نے قافلے والوں سے پوچھا کہ کیا تم نے بھی کبھی چاند کو ایسا دیکھا ہے۔ قافلے والوں نے تصدیق کی کہ فلاں تاریخ کو ہم نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھا تھا ۱۔

شاہ عبدالقادر محدث دہلوی نے نہ تو کسی بدو کا ذکر کیا ہے نہ ہی ابوجہل کی گردن میں پتھر کے پھنسنے کا اور نہ کفار مکہ میں منادی ہونے اور ان کے جمع ہونے کا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس قافلے کا ذکر ہے وہ اسی دن تو نہ آیا ہوگا کیونکہ قافلے ولوں کا جواب بقول شاہ صاحب یہ تھا کہ فلاں دن ایسا ہوا تھا لیکن شاہ صاحب کی تحریر سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ معجزہ کے صدور کے کچھ ہی عرصے بعد قافلہ وہاں آگیا تھا، اگر یہ بات درست ہو تو سوال یہ ہوتا ہے کہ "فلاں تاریخ کو ایسا ہوا تھا" کے معنی کیا ہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب سر دست ہمارے پاس نہیں ہے۔

---

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو موضح القرآن، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۳۷ء مطابق ۱۳۶۷ھ، ص ۵۵۱-۵۵۲۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی اس سلسلے میں ابوجہل کا ذکر فرمایا ہے مگر اس بدو کا مطلق ذکر نہیں کیا ہے جو مکہ معظمہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لیے آیا تھا اور جس کو دھوکا دینے کی وجہ سے ابوجہل مصیبت میں گرفتار ہوا تھا۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے اس واقعے کی جو تفصیل تحریر کی ہے اس کو مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔
ایام حج میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نصف شب میں قبایل میں دعوت دین کے لیے تشریف لے گئے تھے اس وقت حضرت عبداللہ ابن مسعود اور چند دوسرے صحابی آپ کے ساتھ تھے۔ راستے میں کچھ روسائے قریش ملے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کی شکایت کی کہ وہ دوسروں کو تو اپنانے کی کوشش فرماتے ہیں لیکن اپنی سچائی کی کوئی نشانی دکھا کر قریش کو اپنانے کی کوشش نہیں کرتے۔ آپ نے جواب دیا تم لوگ میری بات مانتے ہی نہیں ہو تم کو میرے حق و صداقت کا کیونکر یقین ہو سکتا ہے؟ روسائے قریش نے کہا "کوئی نشان صدق دکھاؤ ہم ضرور مانیں گے؟" ابوجہل بھی ان لوگوں کے ساتھ تھا، اس نے کہا آپ چاند کے دو ٹکڑے کرکے دکھائیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اگر ایسا ہو جائے تو کیا وہ لوگ آپ کو سچا نبی مانیں گے؟ دوسرے روسائے قریش اور ابوجہل نے اثبات میں جواب دیا "آپ نے فرمایا آسمان کی طرف دیکھو معاً چاند دو ٹکڑے ہو گیا ایک ٹکڑا کوہ حرا کے مشرق کی طرف اتر آیا اور دوسرا مغرب کی جانب ہو لیا پہاڑ دونوں کے بیچ میں تھا پھر دونوں حصے اوپر کی طرف چڑھے اور آپس میں مل گئے"۔

ہمارے عہد میں مولانا سید ابو الا علیٰ مودودی نے عام مفسرین کی روش سے قدرے ہٹ کر واقعۂ شق القمر پر روشنی ڈالی ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے اپنی تحقیق تفصیل کے ساتھ تحریر کردی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہجرت سے پانچ سال قبل ایک چودھویں

---

(۵) مولانا تھانوی کی اصل تحریر کے لیے ملاحظہ ہو ص ۲۳-۳۳۸

رات کو چاند یکایک پھٹا اس کا ایک ٹکڑا سامنے کی پہاڑی کی طرف اور دوسرا دوسری طرف رہا۔ یہ کیفیت ایک لحظہ رہی پھر چاند اپنی اصل حالت پر آگیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت منیٰ میں تھے جو حضرات آپ کے ساتھ تھے ان سے آپ نے فرمایا دیکھو اور گواہ رہو۔ مولانا مودودی کی تحقیق کی رو سے نہ تو ابوجہل یا کفار مکہ نے اس معجزے کی فرمائش کی تھی اور نہ ہی یہ معجزہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشت مبارک کے اشارے سے عالم صدور میں آیا تھا۔ مولانا مودودی نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ علما کا ایک بڑا گروہ اس کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں شمار کرتا ہے اور اس بات کا قایل ہے کہ یہ معجزہ کفار مکہ کے مطالبہ پر دکھلایا گیا تھا لیکن مولانا مودودی کو اس بات کو تسلیم کرنے میں اس لیے تامل ہے کہ سوائے حضرت انس کے کسی اور صحابی سے اس طرح کی کوئی بات منقول نہیں ہے۔ مولانا مودودی کے تامل کی سب سے بڑی وجہ خود ان کے الفاظ میں یہ ہے:

"سب سے بڑی بات یہ کہ قرآن مجید خود بھی اس واقعے کو رسالت محمدی کی نہیں بلکہ قرب قیامت کی نشانی کے طور پر پیش کر رہا ہے البتہ یہ اس لحاظ سے حضور کی صداقت کا ایک نمایاں ثبوت ضرور تھا کہ آپ نے قیامت کے آنے کی جو خبریں لوگوں کو دی تھیں یہ واقعہ ان کی تصدیق کر رہا تھا[۱]"۔

اس طول کلامی کا ماحصل یہ ہے کہ زیر نظر مفسر نے سورۃ القمر کی پہلی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے جو طویل قصہ نقل کیا ہے وہ عجیب و غریب بھی ہے اور مزید تحقیق کا طالب بھی۔

زیر نظر تفسیر میں سورۃالفیل کی جو تفسیر درج ہے وہ بھی دوسرے مفسرین سے مختلف ہے جس کی طرف ڈاکٹر جلال متینی نے

---

(۱) اس پوری بحث کے لیے تفہیم القرآن، جلد پنجم، طبع چہارم مرکزی مکتبہ اسلامی دھلی، ستمبر ۱۹۷۷ء ص ۲۲۹-۲۳۰ ملاحظہ ہو۔

بھی اپنے حاشیہ میں اشارہ کر دیا ہے۔ اس مفسر نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی اور یمن کے حاکم ابرھہ کو ایک ھی شخصیت قرار دیا ہے۔ اس سے زیادہ تعجب و حیرت کی بات ہم کو یہ نظر آئی کہ اس مفسر نے سورۃ الکافرون کے بارے میں یہ تحریر کیا ہے کہ "این سورۃ منسوخ است(۱)" خدا جانے کس روایت کی بنا پر اس مفسر نے ایسا بیان دیا ہے۔ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کی شان نزول میں بیشتر مفسرین لکھتے رہے ہیں کہ جس زمانے میں مدینہ میں لبید بن اعصم یہودی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کر دیا تھا اس زمانے میں یہ سورتیں بیک وقت نازل ہوئی تھیں۔ اس مفسر نے کلبی کے حوالے سے لبید بن اعصم یہودی کا ذکر کیا ہے مگر اسی کے ساتھ ساتھ ایک اور روایت بھی تحریر کی ہے جس کی رو سے یہ جادو ام المومنین بی بی صفیہ کی والدہ نے کیا تھا اور اس جادو کا جو اثر بقول مفسر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر پر ہوا تھا ہمارا قلم اس کو نقل کرنے کی جرأت نہیں کر پا رہا ہے لہذا اس سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

اس مطالعے کے آخر میں زیر نظر تفسیر کے دو متون کا مطالعہ پیش کرکے ہم اپنی بات ختم کرتے ہیں۔ سورۃ القلم کی تفسیر کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

"ن و القلم و ما یسطرون. ما انت بنعمة ربک بمجنون. ابن عباس گوید که این سوگند است که خدای عزو جل یاد کرده است بنون. و "نون" آن ماهی است که جهان بر پشت اوست و آن ماهی اندر آب است، زیر آن اندر گاؤ است و زیر گاؤ اندر صخره است و زیر صخره اندر ثری' است، کس نداند که زیر ثری' چیست جز خدای عزو جل. و آن ماهی لیوثا نامست و آن گاؤ بهموث نام است".

[ن۔ قسم ہے قلم کی اور (قسم ہے) ان (فرشتوں) کے لکھنے کی (جو کہ کاتب اعمال ہیں) کہ آپ اپنے رب کے فضل سے

---

(۱) ج ۲، ص ۶۳۷۔

مجنون نہیں ہیں (جیسا کہ منکرین نبوت کہتے ہیں(۱)) . ابن عباس فرماتے ہیں کہ یہ 'ن' کی قسم ہے جو اللہ تعالیٰ نے کھائی ہے اور "ن" وہ مچھلی ہے جس کی پشت پر دنیا (قایم) ہے اور وہ مچھلی پانی میں ہے اس (پانی) کے نیچے چٹان ہے اور چٹان کے نیچے ثری' ہے. اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ ثری' کے نیچے کیا ہے اور اس مچھلی کا نام لیوثا ہے اور اس گاے کا نام بہموث ہے.]

" ضحاک گوید که آن ماهی اندر بزرگی و قوت خویش معجب شد، یکی بر خویشتن بطپید، خواستی که همه جهان زبر و زیر کند انگه خدای عز و جل یکی پشه‌ای را بیافرید تا به بینی.آن ماهی اندر شد، پس باز از بینی بیرون آمد و پیش روی او بنشست. از آنگه باز آن ماهی را دو چشم باز مانده است و اندر آن پشه همی نگرد از بیم او چنین و چنین نه نگریسته است و بر خویشتن هیچ نه جنبیده است و نیارد جنبید از بیم آن پشه".

[ضحاک کہتے ہیں کہ وہ مچھلی اپنی قوت و عظمت پر مغرور ہو گئی ایک بار از خود تڑپنے لگی وہ چاہتی تھی کہ ساری دنیا کو الٹ پلٹ کر رکھ دے. اسی وقت اللہ تعالیٰ نے ایک پسو کو پیدا کیا وہ اس مچھلی کی ناک میں گھس گیا، پھر ناک سے باہر نکل آیا اور اس کے چہرے کے سامنے بیٹھ گیا. اس کے بعد سے اس مچھلی کی دونوں آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور وہ اسی پسو کو دیکھ رہی ہے. اس (مچھلی) نے اس (پسو) کے خوف سے ادھر ادھر نہیں دیکھا ہے اور اس کے خوف سے اپنے آپ کو بالکل جنبش نہیں دی ہے.]

"دیگر ایشون گوید که "نون" نامی است از نامهای عز و جل و آن نون "الرحمٰن" است. دیگر گوید "نون" دویت است

(۱) ترجمہ مولانا تھانوی، ص ۱۱۲۳ .

و این قول سعید بن جبیر است و قتاده. و ابن عباس گوید صاد و نون و قاف و آنچه بدین ماند سوگند است که خدای عز و جل، یاد کرده است و این نامی است از نامهای خدای عزوجل، و سوگند یاد کرده است بقلم و قلم از نور است، درازی قلم چندانست که از زمین تابه آسمان. دیگر ایشون گوید که قلم نام فریشته ای است، "و یسطرون" و ما سوگند یاد کرده بدان فریشتگان که همی نبیسند از کارهای فرزندان آدم."

[دوسرا (شخص) اس طرح کہتا ہے کہ "نون" اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور وہ "نون" "الرحمٰن" ہے۔ دوسرا (شخص) اس طرح کہتا ہے "نون" داوات ہے اور یہ قول سعید بن جبیر اور قتادہ کا ہے اور ابن عباس فرماتے ہیں "صاد" "نون" "قاف" اور جو کچھ اسی طرح ہے وہ قسم ہے جس کا ذکر اللہ نے کیا ہے اور یہ اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور اس نے قلم کی قسم کھائی ہے اور (وہ) قلم نور کا ہے جس کی لمبائی اتنی ہے جتنی زمین سے آسمان (تک کی لمبائی)۔ دوسرا (شخص) اس طرح کہتا ہے قلم ایک فرشتے کا نام ہے۔ "اور ان کے لکھنے کی"—اللہ نے ان فرشتوں کی قسم کھائی ہے جو فرزندان آدم کے اعمال لکھتے ہیں۔]

"ما انت بنعمة ربک بمجنون" تو یا محمد، بدین نعمت که خدا ترا داد از پیغامبری و مسلمانی، دیوانه نیستی. سوگند از بهر اینرا بود. دیگر ایشون گوید "ما انت بنعمة ربک بمجنون" تو یا محمد شکر و منت مر خدای را که دیوانه نیستی چنانکه ایشان همی گویند."

["آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہیں" اے محمد آپ کو اللہ نے پیغامبری اور مسلمانی کی نعمت دی ہے آپ دیوانے نہیں ہیں، قسم اس بات کے لیے تھی۔ دوسرے (شخص) کا قول ہے "آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہیں" اے محمد

آپ اللہ کا شکر ادا کیجیے کہ آپ دیوانے نہیں ہیں جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں .]

درج بالا عبارت سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زیر نظر مفسر دوسروں کی تفسیری روایات سے کس قدر استفادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے . اس حقیقت کے باوجود یہ بات ہمارے حلق سے نہیں اترتی کہ حضرت عبداللہ ابن عباس نے "نون" کو مچھلی قرار دیا ہوگا اور وہ تمام باتیں کہی ہوں گی جو اقتباس بالا کے شروع میں نقل ہو چکی ہیں . دوسری طرف یہ بات بھی ذہن میں رکھنی ہوگی کہ حضرت عبداللہ ابن عباس نے "نون" کو یا تو مچھلی قرار دیا ہوگا یا اسمائے الٰہی میں سے ایک اسم . یہ بات تو قرین قیاس نہیں ہے نہ وہ "نون" کی دو دو تعبیریں کریں . "دوسرا شخص اس طرح کہتا ہے" کے الفاظ لکھ کر اس مفسر نے ایک اور مسئلہ پیدا کر دیا ہے اب ہمارے لیے یہ معلوم کرنا بہت دشوار ہے کہ یہ روایتیں زیر نظر مفسر نے کہاں سے لیں اور ان روایتوں کی اصل کیا ہے ؟

سورۃ النمل کی آیت ۸۲ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوتا ہے "و اذا وقع القول علیہم اخرجنا لہم دابۃ من الارض تکلمہم ان الناس کانو بایتنا لا یوقنون . (اور جب وعدہ (قیامت کا) ان پر پورا ہونے کو ہوگا تو ہم ان کے لیے زمین سے ایک (عجیب) جانور نکالیں گے وہ ان سے باتیں کرے گا کہ کافر لوگ ہماری (یعنی اللہ کی) آیتوں پر یقین نہ لاتے[۱] تھے) اس آیت کے ترجمہ اور تفسیر میں مفسر نے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ یوں ہے :

"و اذا وقع القول علیہم و چون آن گاہ کہ واجب شود عقوبت بر ایشان و سزاوار گردند ایشان مر آن گفتار عذاب را چون آنگاہ کہ امر معروف نہ کنند و نہی منکر . اخرجنا لہم دابۃ

---

(۱) ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی .

من الارض بیرون آریم از بهر ایشان جانوری که اورا "دابۃ الارض" خوانند."

[و اذا..علیهم، اور جب اس وقت کہ ان پر سزا واجب ہوگی اور وہ لوگ اس بات پر عذاب کے مستحق ہوں گے کہ وہ لوگ معروف کا حکم نہیں دیتے اور منکر سے منع نہیں کرتے. اخرجنا...الارض، ہم ان کے لیے ایک جانور جس کو "دابۃالارض" کہتے ہیں، نکالیں۱ گے].

"و علی را رضی اللہ عنہ پرسیدند از این دابۃ کہ آن چہ چیز است علی گفت رضی اللہ عنہ بخدای کہ دم نہ دارد ریش دارد. و این اشارتست از علی کہ او از آدمیان باشد، ہر چند کہ صریح نہ گفت. و نیز گفتہ اند کہ آن دابہ از نشانی ہای قیامت است، جانوریست از جانوران. و آمدہ است در اخبار کہ پرہا دارد خرد و بزرگ، و چہار دست و پای دارد. و این از عبداللہ عباس روایت می کنند."

[اور اس دابہ کے بارے میں لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ یہ کیا چیز ہے؟ علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا، خدا کی قسم دم نہیں رکھتا ہے داڑھی رکھتا ہے، اور یہ حضرت علی کا اشارہ ہے کہ وہ آدمیوں میں سے ہوگا اگرچہ یہ بات انہوں نے صراحت کے ساتھ نہیں کہی ہے اور لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ دابہ قیامت کی علامتوں میں ہے، جانوروں میں سے ایک جانور ہے. روایتوں میں آیا ہے کہ اس کے چھوٹے بڑے پر اور چار ہاتھ پاؤں ہوں گے لوگ اس بات کو عبداللہ بن عباس سے روایت کرتے ہیں.]

"و شعبی گوید کہ آن جانور پست بی موی، ای کہ موی بزان ندارد، و پشم دارد چون اشتر، و سرش بر آسمان می رسد. و نیز گفتہ اند

(۱) مفسر نے "من الارض" کا ترجمہ نہیں کیا ہے.

که جانوریست که سرش چون سر گاو است و چشمش چون چشم خوکان و گوش چون گوش پیلان و سروش چون سروی گوزنان و گردنش چون گردن اشتر مرغ و سینه اش چون سینهٔ شمران و رنگش چون رنگ پلنگان و تهی‌گاهش چون تهی‌گاه گرگان و دلمش چون دم گوسپندان جنگی که سرو دارند و پایهایش چون پای شتران، میان هر بندی از آن او دوازده رش بیرون آید و برو عصای موسیٰ و و انگشتری سلیمان . از آن عصا بر پیشانیٔ مومنان نشان می کند سپید، همه روی مومن سپید کند و از انگشتری سلیمان نشانی نہد سیاه بر پیشانیٔ کافران، همه روی کافر سیاه گردد و این قول عبداللہ دبیر است و این صفت که او کرده است نتوان دانست از خویشتن، از پیامبر شنیده باشد و هر چه پیغامبر گوید باشد گردن باید نہاد . ''

[اور شعبی کہتے ہیں کہ وہ ایک بے بال کا جانور ہے یعنی اس کے بال بکری کی طرح کے نہیں ہیں، اونٹ کی طرح کے ہیں اور اس کا سر آسمان تک پہونچتا ہے. لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ ایک ایسا جانور ہے جس کا سر گایوں کے سر کی طرح اور اس کی آنکھ سوروں کی آنکھوں کی طرح اور کان ہاتھیوں کے کانوں کی طرح اور اس کے سینگ بارہ سنگھوں کی سینگوں کی طرح اور اس کی گردن شتر مرغوں کی گردنوں کی طرح اور اس کا رنگ چیتوں کے رنگ کی طرح اور اس کی کوکھہ بھیڑیوں کی طرح اور اس کی دم ان لڑنے والی بھیڑوں کی طرح جن کے سینگ ہوتی ہے اور اس کے پیر اونٹوں کے پیروں کی طرح. اس کے وجود (جسم) کے ہر جوڑ کے درمیان سے بارہ ہاتھ نکلے ہوئے ہوں گے جن میں (حضرت) موسیٰ کا عصا اور (حضرت) سلیمان کی انگوٹھی (ہوگی) وہ اس عصا سے مومنوں کی پیشانی پر سفید نشان کرے گا، مومن کا پورا چہرہ سفید (منور) ہو جائے گا اور انگوٹھی سے کافروں کی پیشانی پر سیاہ نشان لگائے گا (جس سے) کافر کا پورا چہرہ سیاہ ہو جائے گا. یہ قول عبداللہ دبیر کا ہے. یہ صفات

جو انہوں نے بیان کی ہیں ان کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ان کا اپنا بیان ہے، انہوں نے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سنا ہوگا اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ فرمائیں وہی سچ ہوتا ہے اس پر سر تسلیم خم کرنا چاہیے.]

"و گروهی از مفسران گفته اند که دابه نشانی است از نشانی های قیامت و جزاین نه گفته‌اند. و نیز گفته اند که آن دابه از درهای زمین تهامه بیرون آید و نیز گفته‌اند که از زیر صفا بیرون آید. باز آمدیم بآیت."

[اور مفسروں کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ دابہ قیامت کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے اس کے علاوہ انہوں نے کچھ اور نہیں کہا ہے. اور کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ یہ دابہ تہامہ کی سر زمین کے دوہ سے باہر آئے گا اور کچھ لوگوں کا قول یہ بھی ہے کہ یہ (پہاڑی) صفا کے نیچے سے نکلے گا. ہم آیت کی طرف دوبارہ آتے ہیں.]

"تکلمهم" سخن می گوید این دابه بر آدمیان، میگوید که این مومن است و این کافر. و نیز گفته‌اند سخن گوید بر ایشان. ان الناس کانو بایتنا لا یوقنون. این کلمه او گوید که مردمان هستند که بآیتهای ما ناگرویده به یقین. و اگر کسی تکلمهم خواند "تا" را زیر و "کاف" بجزم و "لام" در زیر: خسته می کند ایشان را و نشان آن خستگی بروی شان پیدا باشد. مفسران گفته‌اند داغ می نهد ایشانرا، و داغ او آن باشد که پیدا کند کفر کافران را و نفاق منافقان را و این آنگه باشد که خدای تعالیٰ نه پذیرد ایمان کافران پس از آن. و آن آنگه باشد که در همه روی زمین یک مومن نمانده باشد، همه کافران پنهان باشند و همه مومنان آشکارا، و همه کافر میرند[۱]."

---

(۱) جلد اول، ص ۳۴۳-۳۴۴.

["وہ ان سے باتیں کرے گا" یہ دابہ آدمیوں سے باتیں کرے گا. وہ کہے گا کہ یہ مومن ہے یہ کافر . اور لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ (دابہ) ان لوگوں سے کہے گا کہ "کافر لوگ ہماری (یعنی اللہ کی) آیتوں پر یقین نہ لاتے تھے" اور اگر کوئی تکلمہم کوت کے زبر، "کاف" کے جزم اور "ل" کے زیر کے ساتھ پڑھتا ہے (تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ) وہ ان لوگوں کو تھکادے گا اور اس تھکان کی علامتیں ان کے چہروں پر ظاہر ہوں گی. مفسروں کا قول ہے کہ وہ ان لوگوں پر داغ کرے گا اور اس کا داغ کرنا یہ ہوگا کہ کافروں کے کفر اور منافقوں کے نفاق کو ظاہر کرے گا اور یہ اس وقت کے بعد ہوگا جب اللہ تعالیٰ کافروں کے ایمان (لانے) کو قبول نہ کرے گا اور یہ اس وقت ہوگا جب روے زمین پر ایک بھی مومن نہ ہوگا. تمام کفار پوشیدہ ہوں گے اور تمام مومن آشکار، اور تمام کافر مر جائیں گے.]

قرآن پاک کا ارشاد صرف اتنا ہے کہ جب قیامت نزدیک ہوگی تو اللہ تعالیٰ زمین سے دابہ نکالے گا جو لوگوں سے باتیں کرے گا. اس کے علاوہ قرآن پاک نے دابہ کے بارے میں کچھ اور نہیں بتلایا ہے لیکن چیزوں کو سمجھنے کا جو انسانی جذبہ ہے اس نے دابہ کو متشکل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کی ابتدا صدیوں پہلے ہی ہو گئی تھی جس کا ایک نمونہ اوپر کی سطور میں درج ہو چکا ہے. نامناسب نہ ہوگا اگر اس موقع پر ہم اردو کی چار اہم تفسیروں کا حوالہ دیتے ہوے دابہ کے بارے میں ہندوستانی مفسرین کے خیالات بھی اختصار کے ساتھ درج کر دیں تاکہ ہم کو معلوم ہو سکے کہ دابہ کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوے بعض مفسرین کہاں سے کہاں چلے گئے ہیں. سب سے پہلے ہم شاہ عبدالقادر محدث دھلوی کے خیالات کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کرتے ہیں.

شاہ عبدالقادر محدث دھلوی نے "کہتے ہیں" لکھ کر اس جانور کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ کچھ اس طرح ہے. ساٹھ گز لمبا چوپایہ،

سارے جسم پر زرد زرد رونگٹے، دو بازو، برق رفتار، منہ انسانوں جیسا مگر انتہائی روشن اور چمکدار، سر اور سینگ نیل گائے جیسے، کان ہاتھی کے سے، رنگ چیتا کا، گردن اور ٹانگیں اونٹ جیسی، چھاتی شیر کی طرح اور دم دنبہ کی ۔ "بعض کہتے ہیں" لکھ کر شاہ صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا سر اور گردن باہر ہوگی بقیہ جسم زمین میں چھپا رہے گا اور اس کے پاس حضرت موسیٰ کا عصا اور حضرت سلیمان کی انگوٹھی کا نگینہ ہوگا جس کو وہ عصا لگاوے گا وہ سفید منہ کا اور جس کو نگینہ لگاوے گا سیاہ منہ کا ہو جاے گا[1]. اس عبارت میں "تفسیر کیمبرج" میں مندرج روایتوں کی کسی حد تک صداے باز گشت محسوس کی جا سکتی ہے حالانکہ گمان غالب یہ ہے کہ "تفسیر کیمبرج" شاہ صاحب کی نظروں سے گذری نہ ہوگی ۔

صاحب تفسیر حقانی نے دابۃ الارض کے بارے میں جو کچھ تحریر کیا ہے وہ انہی کے الفاظ میں درج کیا جاتا ہے ۔ ان کا ارشاد ہے:

"مسلم نے عبداللہ بن عمر سے نقل کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے، قیامت کی اول نشانیوں میں سے آفتاب کا مغرب سے طلوع کرنا اور دابۃ الارض کا لوگوں پر دن چڑھے ظاہر ہونا ہے اور ان میں سے جو کوئی پہلے ہو تو دوسری علامت ساتھ ہی ساتھ ہوگی اور بھی احادیث صحیحہ میں اس کا ذکر آیا ہے۔ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ سے صرف قریب قیامت کے ایک دابہ کا نکلنا ثابت ہوتا ہے جو لوگوں سے کلام کرے گا اور قدرت الہی کا نمونہ ہوگا۔ اب قرآن میں یہ نہیں کہ دابۃ الارض کس شکل کا ہوگا، کوئی چار پایہ ہوگا یا دو پاؤں کا ہوگا، انسان کی صورت ہوگی یا کسی اور چیز کی؟ یہ باتیں علما نے ثابت کی ہیں۔ معالم التنزیل میں حضرت علی کا قول نقل کیا ہے کہ وہ ایسا جانور نہ ہوگا جس کے دم ہو بلکہ داڑھی ہوگی،

---

(۱) تفصیل کے لیے موضح القرآن، مطبوعہ ۱۳۶۸ھ مطابق ۱۹۳۶ء، ص ۵۰۳، ملاحظہ ہو ۔

مراد آپ کی یہ کہ وہ ایک انسان ہوگا۔ عام خیال یہ ہے کہ یہ وہ جانور ہوگا جو کوہ صفا کے زلزلہ آنے کے بعد اس کی کھوہ میں سے نکلے گا اور کلام کرے گا[1] اور اس کا عام چرچا ہوگا۔ دابۃ الارض کی حقیقت بوجہ اختلاف اقوال علماء اسلام معلوم نہیں مگر قرب قیامت میں کوئی زمین پر چلنے والی چیز نمودار ہوگی جو کہ قدرت الٰہی کا نمونہ ہوگی۔ اب خواہ وہ کوئی انسان ہو جو ملک میں دورہ کرکے قدرت کے آثار دکھائے یا کوئی عجیب و غریب جانور ہو جو لوگوں سے باتیں کرے اور مشرکین اور منکرین کو الزام دے العلم عنداللہ آمنا باللہ۔"[2]

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے دابہ کو ایک جانور قرار دیا ہے۔ یہ بولنے والا جانور قیامت قایم ہونے سے پہلے آخری مرتبہ حجت قایم کرے گا۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ یہ ایک ہی جانور ہوگا یا جانوروں کی کوئی مخصوص جنس۔ ان کے نزدیک 'دابۃ من الارض' میں دونوں کا احتمال ہے۔ جہاں تک اس جانور کی شکل و صورت وغیرہ کا سوال ہے اس سلسلے میں مولانا مودودی کا موقف یہ ہے کہ اس سلسلے کی جتنی روایات ہیں وہ سب "باہم بہت مختلف اور متضاد ہیں" اس سلسلے میں ان کے یہ جملے خاص طور سے نقل کرنے کے لائق ہیں:

"ان چیزوں کے ذکر سے بجز ذہن کی پراگندگی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا اور ان کے جاننے کا کوئی فائدہ بھی نہیں کیونکہ جس مقصد کے لیے قرآن میں یہ ذکر کیا گیا ہے اس سے ان تفصیلات کا کوئی تعلق نہیں ہے[3]۔"

---

(۱) یہ عام خیال تو نہیں ہے، کلام پاک اس بات کی صراحت کرتا ہے کہ وہ لوگوں سے باتیں کرے گا۔

(۲) تفسیر حقانی، ج ۵، رمضان ۱۳۹۳ھ، ص ۳۰۰۔

(۳) اس پوری بحث کے لیے تفہیم القرآن، جلد ۳، طبع اول مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، اگست ۱۹۶۹، ص ۶۰۵ ملاحظہ ہو۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی تفسیر میں احادیث صحیحہ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ قیامت قایم ہونے سے پہلے بہت سی عجیب و غریب چیزیں ظاہر ہوں گی ۔ عجیب و غریب چیزوں بارے میں انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ جب تک وہ ظاہر نہیں ہوجاتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے ریل، تار، ٹیلیفون وغیرہ کی مثالیں دی ہیں اور لکھا ہے کہ جب یہ چیزیں ظاہر ہو گئیں تب ہی سمجھ میں آئیں۔ مولانا دریابادی کے نزدیک دابۃ قیام قیامت سے قبل کی آخر ترین علامت ہے اس لیے اگر وہ عجیب ترین بھی ہو تو چنداں باعث تعجب نہیں، مولانا دریابادی نے ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے اس جانور کا نام جساسہ لکھا ہے انہوں نے ''من الارض'' کے قرآنی لفظ پر خاص طور سے زور دیا ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ جانور توالد و تناسل کے ذریعے نہ پیدا ہوگا ''بلکہ یہ از خود پیدا ہو جائے گا'' دابہ کے بارے جو روایتیں دوسری جگہوں پر بیان ہوئی ہیں ان کا بطلان مولانا دریابادی نے امام رازی کے اس قول سے کیا ہے ''کتاب الہی اس باب میں ہر صراحت سے خاموش ہے، اب اگر کوئی بات قول رسول سے ثابت ہو جائے، وہ تو خیر مان لی جائے گی باقی اور کوئی شے قابل التفات نہیں۔''[۱]

ہم نے اس مطالعے کے شروع میں تحریر کیا تھا کہ زیر نظر تفسیر معروف بہ تفسیر کیمبرج میں قصص و روایات کا عنصر دوسری تفسیروں کے مقابلے میں کم ہے۔ جب ہم نے اس تفسیر پر ایک سر سری نظر ڈالی تو ہم کو اس میں بہت سی باتیں ''عجیب و غریب'' نظر آئیں جن میں سے چند کا تذکرہ درج بالا سطور میں کردیا گیا ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ اگر اس تفسیر میں بھی قصص و روایات کی بہتات ہوتی تو اس کو ''عجیب و غریب تفسیر'' قرار دیا جا سکتا تھا۔ بہ ہر حال صرف درج بالا باتوں ہی سے اس امر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے ایرانی مسلمانوں میں کس قسم کے افکار و خیالات کا غلبہ تھا اور قرآن مجید کی تفسیر میں بھی ان افکار و خیالات کا کس حد تک عمل دخل تھا۔

---

(۱) تفسیر ماجدی، مطبوعہ تاج کمپنی لمٹڈ، ص ۵۰۵ میں یہ پوری بحث ملاحظہ ہو۔

فہرست اردو مطبوعات

ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۱ -	ہندوستان میں عربی ادب اور علوم اسلامیہ کی تدریس و تحقیق	از ڈاکٹر عبد العلیم	قیمت Re. 3.00
۲ -	جدید فارسی شاعری	از پروفیسر منیب الرحمٰن	قیمت Rs. 10.00
۳ -	ترکی	از پروفیسر اکمل ایوبی	قیمت Rs. 25.00
۴ -	عراق	از پروفیسر محمود الحق	قیمت Rs. 20.00
۵ -	عبد الرحمن الکواکبی	از پروفیسر محمود الحق	قیمت Rs. 40.00
۶ -	ابن الفارض	از ڈاکٹر غلام مصطفی	قیمت Rs. 35.00
۷ -	اصول فہرست نگاری	از محمود الحسن قیصر	قیمت Rs. 20.00
۸ -	جدید تاجیک شعرا	از پروفیسر کبیر احمد جائسی	قیمت Rs. 60.00
۹ -	علوم اسلامیہ اور ہندوستانی علما	از پروفیسر سالم قدوائی	قیمت Rs. 60.00
۱۰ -	فارسی قصیدہ نگاری	از پروفیسر نذیر احمد	قیمت Rs. 45.00
۱۱ -	چند ایران شناس	از پروفیسر کبیر احمد جائسی	قیمت Rs. 80.00

ملنے کا پتہ

PUBLICATIONS DIVISION
Aligarh Muslim University
Aligarh—202001

افادات اقبال پر ایک نظر

شبیر احمد خاں غوری*

عہد حاضر میں اسلامی مشرق نے جن عظیم شخصیتوں کو جنم دیا ہے، ان میں علامہ اقبال کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ اپنی تعلیم کے اعتبار سے وہ فلسفی تھے، پیشہ کے لحاظ سے قانون داں یا بیرسٹر، ادبی حیثیت سے شاعر نغز گفتار اور پبلک زندگی میں مفکر و مصلح۔ انہوں نے ملت مرحومہ کی عروق مردہ میں نئی جان ڈالنے کے لیے ایک پیغام عمل دیا، جس کے ابلاغ کے لیے ان کے نفس گرم نے اپنی خداداد شاعرانہ صلاحیتوں کو وقف کر دیا اور اسے مستحکم اور پائدار بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے اپنی فلسفیانہ تبحر و تمہر سے بھر پور فائدہ اٹھایا۔

ان کی عمر عزیز کا معتدبہ حصہ تحصیل علم میں گزرا، پہلے اسکول، پھر کالج، پھر یونیورسٹی اور آخر میں ولایت۔

اسکول اور کالج میں شفیق استاد کی شاگردی نے ان کی ادبی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ نکتہ سنجی اور نکتہ آفرینی کی ٹیکنیک میں دستگاہ عالی پیدا کرنے کے لیے انہوں نے اساتذہ قدیم کے دواوین و کلیات کا بڑی دقت نظر سے مطالعہ کیا اور شاعرانہ تلمیحات کے روایتی بیانات پر وقوف بہم پہونچایا۔ یہی معلومات آیندہ چل کر ان کے "مطالعۂ اسلامیات" کا بنیادی سرمایہ بنیں۔

شمس العلماء میر حسن اپنے وقت کے بڑے فاضل تھے اور متداول اسلامی علوم سے آشنا۔ لیکن قدیم مدارس کے علماء بوریا نشین کی

---

* مولانا شبیر احمد خاں غوری، سابق رجسٹرار، امتحانات عربی و فارسی، سررشتۂ تعلیم، اتر پردیش، الہ آباد۔

طرح علوم درسیہ میں ان کے تبحر و تعمق کی کیفیت ہنوز منظر عام پر نہیں آئی۔ اس لیے شاعرانہ ذوق کی تربیت کے ساتھ ہونہار شاگرد کی معلومات میں انھوں نے جو اضافہ کیا، اس کی نوعیت ہنوز گوشۂ گمنامی ہی میں ہے۔

کالج اور یونیورسٹی میں فلسفہ ان کے مطالعہ کا خصوصی موضوع تھا۔ اسی فلسفہ میں انھوں نے امتیاز کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا اور اسی میں تخصص کے لیے وہ ولایت تشریف لے گئے۔ وہاں انھوں نے بیرسٹری کی سند حاصل کی، لیکن یہ مقصود بالذات نہیں تھی، ایک ضمنی مشغلہ تھا، اگرچہ بعد میں کسب معاش کے لیے انھوں نے اسے ہی اپنا پیشہ بنا لیا۔ فلسفہ کے اندر ان کا مطالعہ صرف نصابی کتابوں ہی تک محدود نہ تھا، بلکہ مختلف فکری تحریکوں اور فلسفیانہ مذاہب فکری کا بھی انھوں نے بڑی دقت نظر سے مطالعہ کیا۔ مگر یہ مطالعہ صرف یورپی حکماء کے افکار سے واقفیت تک محدود تھا۔

اسلامی فلسفہ تک نارسائی

قدیم، بالخصوص حکماء اسلام کی کاوشوں تک ان کی رسائی نہیں ہو سکی اور ہو بھی کس طرح سکتی تھی۔ دانشمندان یورپ نے قرون وسطیٰ کے مسیحی مفکرین کی تفکیری سرگرمیوں کو جہالت کے پشتارہ سے تعبیر کیا تھا۔ ان کی تقلید میں متجددین روزگار نے علوم عقلیہ میں افاضل اسلام کی سرگرمیوں کو "کوہ کندن و کاہ برآوردن" و "دقیانوسیت" اور خدا معلوم کن کن مضحکہ خیز خطابات سے نوازا تھا۔ ادھر خود مدارس میں معقولات (منطق و فلسفہ) کی تعلیم چند گھسی پٹی کتابوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ غیر کلاسیکی (غیر ابن سینائی) فلسفہ سے اعتناء کا سوال ہی نہیں تھا۔ فلسفیانہ سرگرمیوں کی وہ منظم پیش‌کش جو آج تحقیقی کاوش کی بدولت عام ہے، علمائے مدارس کے لیے لاطینی سے کم نہیں تھی، اور اگر ہوتی بھی تو اس کا پورا سرمایہ عربی میں ہوتا، جس کے

فوہر علامہ کو وہ قدرت نہیں تھی، جو انگریزی پر تھی۔

ظاہر ہے ان حالات میں، جب خود عربی ... کے اندر یہ اندازہ مفقود ہو تو پھر اس زمانہ کی یونیورسٹیوں میں کسی "اسلامی فلسفہ" کی تعلیم کا کیا سوال ہوتا۔ یہ تو جب سے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی قائم ہوئی ہے، یہاں کے ارباب حل و عقد ... اس جانب توجہ ہوئی ہے، اگرچہ ہنوز روز اول ہے۔

بہرحال ولایت جانے سے پہلے مسلم کلاسیکی نیز متعلقہ علوم اسلامیہ کے ساتھ علامہ کے اعتناء کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اسلامی فلسفہ کے ساتھ اعتناء

مگر یہ بات بھی ایک اعجوبہ سے کم نہیں کہ ولایت پہونچ کر انھوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے جو موضوع منتخب کیا وہ اسلامی فلسفہ ہی تھا، اور اس کاوش کو انھوں نے

"Development of Metaphysics in Persia"

کے عنوان سے موزخ میں پیش کیا۔ مگر جس بنیادی سرمایہ کی مدد سے انھوں نے یہ مقالۂ فضیلت مرتب کیا، وہ یا تو فضلائے یورپ کی "تحقیقات انیقہ" پر مشتمل تھا، یا پھر مفکرین اسلام کے وہ چند اصل کتب و رسائل تھے، جن کا ان کے یورپی اساتذہ نے مشورہ دیا تھا اور جس سے انحراف ان کے لیے بمنزلہ الحاد تھا۔ اس کے بعد اس نام نہاد "فلسفۂ عجم" کی علمی و تحقیقی حیثیت کسی مزید تبصرے کی محتاج نہیں رہتی۔ چنانچہ جب بزم اقبال، لاہور نے اس کتاب کا نیا ایڈیشن شائع کیا تو پروفیسر ایم۔ ایم شریف نے (جو اقبال کے استاد میک ٹیگرٹ ہی کے شاگرد تھے، اور جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں عرصۂ دراز تک فلسفہ کے پروفیسر اور صدر شعبہ رہے تھے اور اس لیے اسلامی فلسفہ سے فی الجملہ واقف ہو چکے تھے) اس نئے ایڈیشن کے پیش لفظ میں لکھا:

"... observations regarding Al-Farabi, Ibn-Maskwaih and ... more or less echoed the views of early Western

مثال کے طور پر اگر ملا محمود جونپوری کو [illegible] بازغہ" میں میر باقر داماد کے "نظریہ حدوث دہر [illegible] پرخچے اڑادیئے تھے، کسی ہم عصر یورپی فلسفی کی کسی کتاب کا ترجمہ مل جاتا، تو اس کی تنقید و تنقیص [illegible] اس کے سمجھنے میں بھی داتوں کو پسینہ آجاتا [illegible] الہ آبادی کی "تسویہ" کا جس سہولت سے رد لکھ [illegible] یا سپنوزا کے کسی شاہکار پر اس سہولت سے تبصرہ فرما سکتے۔

اور کچھ ایسی ہی صورت حال علامہ کے ساتھ پیش آئی۔ انھوں نے سنا تھا کہ امام رازی نے "مسئلۂ زمان" پر اپنی کتاب "المباحث المشرقیہ" میں بڑی سیر حاصل بحث کی ہے۔ مگر جب اس کے پڑھنے اور سمجھنے میں تکلف ہوا، تو پہلے تو سید سلیمان ندوی سے اس کتاب کی کمیابی کا شکوہ کرتے "زمانہ" کے باب میں امام رازی کے خیالات کا خلاصہ قلمبند کرکے ارسال فرمانے کی درخواست دی اور بعد میں انھیں اطلاع دی:

"امام رازی کی مباحث مشرقیہ میں آج کل دیکھ رہا ہوں"۔

معلوم نہیں سید صاحب نے مطلوبہ خلاصہ بھیجا یا نہیں، اور اگر بھیجا بھی ہو تو علامہ اس سے کوئی استفادہ نہ کرسکے اور نہ ہی اپنے ذاتی مطالعہ سے کچھ اخذ کر سکے، کیونکہ نہ تو "خطبات" میں اس کی کوئی شہادت ملتی [illegible] نہ ہی "خطبات" کے اردو ترجمہ میں جو ان کی حک و [illegible] کے بعد شائع کیا گیا تھا، اس استفادے کا کوئی اشارہ ملتا [illegible] آخری زمانہ کے کلام میں اس کا کوئی الہام نظر [illegible]۔

یہی حال "شرح مواقف" کا ہے جس کے مطالعہ [illegible] کو اپنے مکتوب مورخہ ۲ ستمبر ۱۹۳۳ میں اطلاع [illegible]

"شرح مواقف دیکھ رہا ہوں"

مگر اس سے استفادہ کی بھی کوئی ادنیٰ جھ[illegible] نہیں ملتی۔

اس سے زیادہ دلچسپ قصہ " اتقان العرفان " سے استفادے کا ہے۔ غالباً سید صاحب نے " مسئلہ زمان " کے سلسلے میں متکلمین اسلام کے خیالات سے واقف ہونے کے لیے دوسری کتابوں کے علاوہ مولانا برکات احمد صاحب ٹونکی کے رسالہ " اتقان العرفان " کا بھی مشورہ دیا، جو انہوں نے ایک دوست کی مدد سے حاصل کر لیا۔ علامہ نے اس رسالہ کو پڑھا اور سمجھا۔ مگر کیا سمجھا، یہ خود انہیں سے سنئے۔ اپنے اگلے مکتوب میں فرماتے ہیں:

"مولوی سید برکات احمد مرحوم نے دھر اور زمان میں امتیاز کرکے کسی قدر مشکلات کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔"

للعجب! علامہ نے اس تدقیق کو بیک جنبش قلم مولانا برکات احمد مرحوم کی طبعزاد قرار دے دیا، حالانکہ "دھر" اور "زمانہ" کی یہ تدقیق بہت قدیم ہے۔ مولانا برکات احمد سے کوئی سات سو سال قبل امام رازی نے " المحصل " میں اس کا حوالہ دیا تھا۔ نیز "مباحث مشرقیہ" میں اس تدقیق کو انہوں نے (امام رازی نے) شیخ بو علی سینا کی طرف منسوب کیا ہے جو مولانا برکات احمد صاحب سے کوئی ایک ہزار سال پہلے تھا۔ لیکن یہ تدقیق غالباً شیخ بو علی سینا سے بھی پہلے کی ہے، کیونکہ اسی طرح کی ایک تدقیق نو فلاطونی فلسفی دمسقیوس (Damascsius) کے یہاں ملتی ہے اور اسی سے فلاسفہ اسلام کے یہاں آئی۔ مگر علامہ ہیں نہ اسے مولانا برکات احمد کی طبع زاد فرما رہے ہیں۔

اور اس سے بھی زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ مولانا برکات احمد اپنے آخر کی تصنیف میں خود اس تدقیق کے منکر بلکہ اس سے بیزار اور دریے ابطال ہیں۔ وہ مسئلہ زمان کی مشکلات کو کم کرینگے؟ وہ تو اس تدقیق کا بار بار حوالہ دے کر مسئلہ کی مشکلات کو اور بڑھاتے ہیں، تا آنکہ زمانہ کے (وجود خارجی کے) قائل تھک کر اپنے دعوے ہی سے دستبردار ہو جائیں۔ ان کے (مولانا برکات احمد کے) آخری الفاظ ہیں:

"فان القول بالدھر بافواھہم"۔

[کیونکہ "دھر" کا قول انھیں (زمانہ کے وجود خارجی کے مدعیوں) کے منہ سے نکلا ہوا قول ہے]

اس خوش فہمی کی وجہ ظاہر ہے کہ سنہ ۲۸-۳۲-۱۹۳۵ء ان کی پختگیٔ فکر کا زمانہ ہے جبکہ یورپی فلاسفہ ھیگل، برگسان نتشے، آئن سٹائن وغیرہ وغیرہ شعوری طور ان کے دل و دماغ میں رچ بس چکے تھے اور ان کا انداز فکر ان پر غالب آچکا تھا۔ حکمائے اسلام کے افکار کے اخذ و ادراک کے لیے جس ذہنی پس منظر کی ضرورت ہے، ان کے پاس برائے نام ھی تھا۔

علامہ کی علمی صلاحیت مسلم، مگر ھرکام کے لیے عمر کی ایک مخصوص منزل ہوا کرتی ہے اور یہی بنیادی سبب ہے ان کے اکثر تسامحات کا۔

رھنماؤں کی منزل ناشناسی

دوسری وجہ ان کی خوش فہمی تھی جو اکثر غلط فہمی پر منتج ہوا کرتی تھی۔ انھیں بعض معاصرین کے ساتھ غیر معمولی عقیدت تھی اور وہ انھیں علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرھاد کہا کرتے تھے۔ مگر "ھر مردے و ھر کارے" اور یہ خوش فہمی انھیں اتنی تحقیق کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ یہ افاضل "کن علوم کی جوئے شیر کے فرھاد" ہیں اور کن علوم میں انھی کی سطح پر ہیں۔ وہ ان درسگاھوں کے فارغ التحصیل فضلاء سے بھی اپنے پسندیدہ علوم میں تبحر و دستگاہ عالی کی خوش فہمی میں مبتلا تھے، جہاں سے نامراد "معقولات" کو دیس نکالا ملا تھا۔ مثلاً انھوں نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا:

"شمس بازغہ یا صدرا میں جہاں زمان کی حقیقت کے متعلق بہت سے اقوال نقل کئے ہیں، ان میں ایک قول یہ ہے کہ زمانہ خدا ہے۔ بخاری میں ایک حدیث بھی اسی مضمون کی ہے کہ لاتسبوا الدھر الخ۔ کیا حکمائے اسلام میں سے کسی نے

یہ منصب اختیار کیا ہے۔ اگر ایسا ہو تو یہ بحث کہاں ملیگی۔"

۱۔ "صدرا" اور "شمس بازغہ" اس زمانہ میں کوئی نادر و نایاب کتابیں نہیں تھیں۔ درس نظامی کی معقولات میں مشمول تھیں اور اعظمگلہ تو علوم اسلامیہ کا مرکز تھا۔ کتنی گلیں میں مدرسے تھے، جہاں اس وقت ان کتابوں کے سیکڑوں نسخے ہوں گے۔ خود دارالمصنفین میں بھی ان کتابوں کے متعدد مطبوعہ اور مخطوطہ نسخے ہونگے۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ مکتوب الیہ انہیں ہاتھ سے چھونا بھی ناجائز سمجھتے تھے، ورنہ اقبال کے خط کا جواب کوئی ایسا مشکل مسئلہ نہ تھا، کیونکہ دونوں کتابوں ("صدرا" اور "شمس بازغہ") میں مسئلہ زمان کی بحث کے آخر میں اس منصب کو کہ "زمان واجب الوجود ہے" مرجوح اور ضعیف بتایا گیا ہے اور اس کا رد بھی لکھا ہے۔

۲۔ خیر یہ تو نامراد معقولات کی بات تھی۔ مگر حدیث لاتسبوا الدھر کے ذریعہ "تالہ زمان" پر استدلال کے لیے مکتوب الیہ نے منع نہ فرما کر اچھا نہیں کیا۔ یہ حدیث تو صحاح ستہ کی اکثر کتابوں میں مذکور ہے۔ اس پر خاموشی اختیار کرکے اور اس کے صحیح معنی نہ بتا کر انہوں نے سائل کو بھٹکنے کے لیے آوارہ چھوڑ دیا۔ والی اللہ المشتکیٰ!۔

۳۔ رہا تیسرا سوال کہ "کیا حکمائے اسلام میں سے کسی نے یہ منصب اختیار کیا ہے؟" تاریخ فکر اسلامی کا بڑا مشکل سوال تھا۔ مگر غالب ظن یہ ہے کہ اگر علامہ خود کاوش و تحقیق سے کام لیتے تو شاید زیادہ مفید نتائج پر پہونچ سکتے تھے۔ مگر برا ہو خوش فہمی کا کہ نہ خود کوئی مثمر نتیجہ اخذ فرما سکے اور نہ یہ عقیدت مفرطہ ہی کسی کام آسکی۔ ان کی بنیادی غلطی یہی تھی کہ

آنچہ خود داشت زبیگانہ تمنا می کرد

اسی طرح انھوں نے پیر مہر علی شاہ گولڑوی سے بھی مسئلہ زمان کے متعلق شیخ ابن عربی کے خیالات معلوم کرنا چاہے تھے، کیونکہ پیر صاحب اپنے وقت کے جامع شریعت و طریقت شیخ تھے اور علوم ظاہری و باطنی دونوں میں دستگاہ عالی رکھتے تھے۔ علامہ کا انداز فکر کچھ اس طرح کا تھا:

• چونکہ پیر صاحب تصوف کے اسرار و رموز کے محرم راز ہیں،

• اس لیے شیخ اکبر کے افکار پر بھی علی وجہ البصیرہ خبرۃ تامہ رکھتے ہونگے،

• اس لیے "فتوحات مکیہ" کی تعلیمات کے بھی دانائے رموز ہونگے،

• اس لیے شیخ اکبر نے "فتوحات مکیہ" کے اندر مسئلہ زمان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کی شرح و توضیح علیٰ وجہ الکمال کر سکتے ہیں۔

لیکن

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

سید صاحب نے مطلوبہ خلاصہ بھیجنے کا وعدہ بھی کر لیا، بلکہ لکھائی تین سال بعد بھیج بھی دیا، مگر پیر صاحب نے علامہ کے خط کو درخور جواب تک نہ سمجھا۔

اس قسم کا ایک واقعہ رسالہ "غایۃ الامکان فی معرفۃ الزمان و المکان" کے سلسلے میں رونما ہوا۔ "مسئلہ زمان" کے ساتھ اقبال کی غیر معمولی دلچسپی کے پیش نظر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے انھیں ایک رسالہ دیا تھا، جس کا نام "غایۃ الامکان فی درایۃ الزمان" بتایا تھا اور کہا تھا کہ یہ عراقی کی تصنیف ہے۔ علامہ اس سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور "خطبات" کے تیسرے اور پانچویں لیکچر میں عراقی کی طرف منسوب کر کے اس کا خلاصہ نقل کر دیا۔

ان کے متبعین نے بھی اس انتساب پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس نہیں کی ، چنانچہ پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم نے "فکر اقبال" میں اور ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے " اقبال کا تصور زمان و مکان" میں اس توضیح کو عراقی ہی کی طبعزاد بتایا۔

بعد میں دوسرے فضلاء نے بھی اسے ایک حقیقت واقعی سمجھ لیا ، حالانکہ اس کی وجہ سے بڑی الجھنیں پیدا ہو گئیں ، چنانچہ دہلی یونیورسٹی میں جب ڈاکٹر آموجہ نے عراقی پر اپنا مقالۂ فضیلت مرتب کیا تو اس بات کی تحقیق کی ، مگر کہیں بھی انھیں اس مزعومہ "رسالۂ عراقی" کا سراغ نہ مل سکا ۔ اسی طرح جب ڈاکٹر سعید نفیسی نے "کلیات عراقی" کو ایڈٹ کیا تو انھیں بھی اس کا کہیں پتہ نہ چلا ۔

لہذا اس کے درپے تحقیق و جستجو ہونا فطری تھا ۔ سنہ ۱۹۶۰ء کے قریب راقم الحروف کو رامپور جانے کا اتفاق ہوا ۔ میں اس زمانہ میں "اقبال کے تصور زمان" کے سلسلے میں جو کچھ لکھ رہا تھا ، وہاں رضا لائبریری کی فہرست کتب فارسی میں اس عنوان سے ملتے جلتے دو رسالوں کا نام ملا ۔ نکلوا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ مضمون وہی ہے جو اقبال نے خطبات میں عراقی کے حوالے سے نقل کیا ہے ، مگر مصنف کا نام مختلف تھا یعنی عین القضاۃ سید (علی) ہمدانی ۔ یہ دو شخصیتیں ہیں : ایک ابو الفضائل عین القضاۃ عبداللہ بن محمد المیانجی اور دوسرے امیر سید علی بن شہاب الدین بن محمد الہمدانی ۔ ہمدانی دونوں ہیں اور عراقی بھی ہمدانی ہیں ۔ امیر سید علی ہمدانی نے تصوف میں رسائل کی ایک کثیر تعداد لکھی ہے ، مگر اس کثرت تعداد کے باوجود نہ تو ان میں اس عنوان کا کوئی رسالہ ہے اور نہ ان میں سے کسی کے نام ہی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا موضوع "مسئلہ زمان و مکان" ہوگا ۔

عین القضاۃ ہمدانی اپنے تلمذ کے اعتبار سے فلسفی مزاج صوفی معلوم ہوتے ہیں ۔ بیہقی نے "تتمۂ صوان الحکمۃ" میں لکھا ہے کہ

وہ امام غزالی کے برادر اصغر احمد غزالی کے اور فلسفی شاعر و ہیئتدان عمر خیام کے شاگرد تھے۔ اس لیے گمان ہوا کہ انھوں نے فلسفہ کے اس مغلق مسئلے پر خامہ فرسائی کی ہوگی۔ لیکن اگر وہ اسی فلسفیانہ مزاج کے تھے تو شاید ان کی کسی دوسری کتاب میں اس انداز تفکر کی جھلک مل جائے۔ ان کی ''زبدۃ الحقائق" مشہور ہے۔ شاید اس کتاب کی تفلسف پژوھی ہی کی بنا پر قہستان کے باطنی النحلہ امیر محتشم ناصرالدین اس سے متاثر تھا اور اسی وجہ سے اس نے مجدد فلسفہ خواجہ نصیرالدین طوسی سے اس کی شرح لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ محقق طوسی کی "شرح زبدۃ الحقائق'' تو نہیں مل سکی، مگر شیخ بندہ‌نواز گیسودراز نے اس پر جو شرح لکھی تھی، وہ مل گئی مگر اس میں ''زمان'' و "مکان" کی کوئی بحث ہی نہیں ہے۔

عراقی کی ''لمعات" میں بھی ان مسائل سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا، لہذا تھک کر یہ کاوش ہی چھوڑ دی۔

مگر جس زمانہ میں علامہ پیر مہر علی شاہ اور ماسٹر عبداللہ چغتائی کو کمال تیقن کے ساتھ لکھ رہے تھے کہ زیر بحث رسالہ اور اس میں مذکور توضیح عراقی کی طبعزاد ہیں، اسی زمانہ میں ایک ایرانی فاضل مرزا عبدالحسین مونس نعمت اللہی نے "رسائل شاہ نعمت‌اللہ" کے ساتھ زیر بحث رسالہ کو بھی شائع کر دیا۔ ادھر ایک اور فاضل احمد منزوی نے فارسی مخطوطات کی ایک مبسوط فہرست بعنوان "فہرست نسخہائے خطی فارسی" شائع کی اور اس میں اسی[1] کتاب کے کوئی سترہ نسخوں کا ذکر کیا۔ اسی دوران میں مختلف کتب خانوں کے فہرست نگاروں نے اس سلسلے میں صوفیا کے تذکروں میں مولانا جامی کی ''نفحات الانس" اور حاجی خلیفہ کی "کشف الظنون'' کھنگال ڈالیں، جس سے معلوم ہوا کہ

۱۔ رسالہ کا صحیح نام "غایۃ الامکان فی معرفۃ الزمان و المکان" ہے، اور

۲- مصنف کا نام "شیخ محمود الاخسنوری ہے (ہو اور نام تاج الدین محمود بن خداداد اشنہی)

مولانا کشمیری کا علمی تبحر، علم حدیث میں ان کا پایۂ عالی اور علوم متداولہ میں ان کی دستگاہ عالی حقیقت مسلمہ ہے، مگر "کتابیات" (Bibliography) کا فن ایک بالکل ہی جداگانہ علم ہے۔ ضروری نہیں کہ ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کرنے والا انجنیر گل بنفشہ کی مختلف اقسام میں بھی امتیاز کر سکے کہ

ہر مردے و ہر کارے

نظریات تراشی

علامہ اقبال کے تسامحات کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ صحیح معلومات کی کوتاہی طلب کی تلافی خود ساختہ نظریات سے کیا کرتے تھے اور پھر اس پر بڑی بلند فکری عمارتیں تعمیر فرماتے، جو

"ان اوھن البیوت لبیت العنکبوت"

کا مصداق ثابت ہوتیں۔ مثلاً انہوں نے ایک نظریہ یہ تراشا تھا کہ

"The spirit of the Quran was essentially anti-classical"

[قرآن کی روح بنیادی طور پر "کلا سیکیت بیزار" (یا "مخالف یونانیت پسندی") ہے]

انہیں اس نظریہ کی صحت پر اتنا شدید اصرار تھا کہ وہ بزعم خود اسے واضح بالذات اور مستغنی عن الثبوت سمجھتے تھے۔ پھر اس پر انہوں نے تخیلات کی سربفلک عمارتیں قائم فرمائیں۔ مثلاً

"اس حقیقت کو نہ سمجھتے ہوئے کہ قرآن کی روح بنیادی طور پر کلاسیکیت بیزار (مخالف یونانیت پسندی) ہے اور یونانی

مفکرین پر پورا اعتماد کرتے ہوئے مسلمانوں میں پہلا رجحان و میلان یہ پیدا ہوا کہ وہ قرآن کو یونانی فلسفہ کی روشنی میں سمجھیں"

دوسری جگہ فرماتے ہیں :

"قرآن کے ابتدائی طالب علم قرآن کو یونانی فکر کی روشنی میں پڑھتے اور سمجھتے تھے۔ انہیں اس حقیقت تک پہونچنے میں کہ قرآن کی روح حقیقی طور پر یونانیت بیزار ہے، دوسو سال لگے"

اس اصرار بیجا کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اسلامی ثقافت کو یونانی علوم کی افادیت سے مایوسی کا نتیجہ قرار دیا۔ فرماتے ہیں :

"قرآن کو یونانی فکر کی روشنی میں پڑھنے اور سمجھنے کی اس کوشش کا نتیجہ، ناکامی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا اور اسی ناکامی کے نتیجہ میں اسلامی ثقافت کی حقیقی روح جلوہ گر ہوئی۔"

غرض علامہ کے نزدیک اسلام میں مختلف علوم حکمیہ کی ترقی یونانی فکر کے خلاف مسلمان مفکرین کی ذہنی بغاوت کا نتیجہ تھی۔ فرماتے ہیں :

"یہ اشاعرہ کی ما بعد الطبیعی تفکیر میں بالکل واضح ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ اس تنقید میں نمایاں ہے، جس کے ساتھ مسلمانوں نے یونانی منطق پر تبصرہ کیا۔"

ان میں سے ہر دعویٰ تاریخی حقائق کے ساتھ دست و گریبان ہے۔ مگر نہ تو اقبال کو اس بات کے دیکھنے کی فرصت ملی اور نہ عقیدتمندان اقبال کو کورانہ عقیدت نے اس پر ناقدانہ نظر ڈالنے کی اجازت دی، حالانکہ ان میں سے ہر دعوی کی سخافت اظہر من الشمس ہے کیونکہ

۱۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ قرآن کریم کے ابتدائی طالب علم صحابۂ اکرام تھے (پھر تابعین اور پھر تبع تابعین) اور وہ قرآن حکیم

کو محض قرآن یا ارشادات نبوی کی روشنی میں پڑھتے اور سمجھتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی یونانی فلسفہ کا واقف کار نہ تھا۔ ابھی تو خود یونانی فلسفہ بھی مسلمانوں میں متعارف نہیں ہوا تھا۔ یونانی حکمت تیسری صدی ہجری میں بعہد خلیفہ المامون عربی میں ترجمہ ہونا شروع ہوئی۔

۲۔ قرآن کی روح جس کے لیے انسان کی تخلیق ہوئی، جسکی یاد دہانی کے لیے انبیاء و رسل مبعوث ہوئے جس کے ابلاغ کے لیے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جہاد سیفی کے لیے مامور ہیں، جسے خود شارع علیہ السلام نے متعین کر دیا ہے، اور جو اسلام اور کفر کے مابین فارق ہے، "توحید عبودیت" ہے جو "کلاسیکیت" (یونانیت پسندی) اور "کلاسیکیت بیزاری" دونوں سے بلندتر ہے۔

۳۔ اسلامی ثقافت کی حقیقی روح اس کی "شرک بیزاری" ہے جو مظاہر کائنات کے سامنے گڑگڑانے اور بھیک مانگنے کے بجائے اس کی "تسخیر" کا حکم دیتی ہے۔ یہی تسخیر کائنات کا جذبہ اسلام کے علوم حکمیہ کا سر چشمہ ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ تسخیر کائنات کا یہ جذبہ اور اس کا سر چشمہ یعنی شرک بیزاری نہ یونانی فلسفہ میں توغل و مشغولیت سقراطہ کا نتیجہ ہے اور نہ اس کی افادیت سے مایوسی کا۔

۴۔ اسلامی علوم کا آغاز و ارتقا یونانی فلسفہ کے خلاف بغاوت کا مصداق نہیں ہے، بلکہ اس کی اصلاح اور اس میں چار چاند لگانے کے مترادف ہے۔ کاش علامہ **Evolution** اور **Revolution** کا فرق کماحقہ ملحوظ رکھتے۔

بہر حال

الف۔ اشاعرہ کی مابعدالطبیعیاتی تفکیر معتزلہ سے ماخوذ ہے اور اعتزال "یونانیت بیزاری" کا نام نہیں ہے۔ امام ابوالحسن الاشعری نے اعتزال کے مخصوص معتقدات یعنی عقیدۂ خلق قرآن،

انکار رویت الٰہی، انکار صفات باری وغیرہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا، مگر ان کا مابعدالطبیعی سرمایہ لے کر فرقۂ اہل السنت و الجماعت میں شریک ہوئے تھے۔ اس لیے اشاعرہ کی مابعدالطبیعی تفکیر یونانی فلسفہ کے خلاف بغاوت نہیں ہے۔

ب۔ رہی یونانی منطق پر تنقید تو ایسا اندیشہ ہوتا ہے کہ "فلسفۂ عجم" کے فاضل مصنف نے مسلمانوں کی علمی و حکمی سرگرمیوں کی تفصیلی تاریخ کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ ارسطو کی منطق عبداللہ بن المقفع کے زمانے سے (جس نے پہلی مرتبہ ارسطا طالیسی منطق کی پہلی تین کتابوں قاطیغوریاس (Categories) باری ارمیناس (Pari Hermensticae) اور انالوطیقائے اولیٰ (Analylicae) نیز فرفوریوس (Porphyry) کی ایساغوجی کو عربی میں ترجمہ کیا تھا) "سلم العلوم" کے شارحین، بلکہ "مرقاۃ المنطق" کے فاضل مصنف مولانا فضل امام خیرآبادی کے زمانہ تک اسلامی سماج میں منطق کا واحد مصداق سمجھی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ اور بھی منطقی نظام تھے، جیسے متکلمین کا جو "جدل" کہلاتا تھا، اشراقیہ کا (جس پر شہاب الدین مقتول کی "حکمۃ الاشراق" کا پہلا حصہ مشتمل ہے)۔ کہا جاتا ہے کہ ابوالبرکات بغدادی نے بھی "کتاب المعتبر" کے پہلے حصہ میں ارسطو کے اقوال سے اختلاف کیا ہے مگر قاضی نوراللہ شوستری نے "مجالس المؤمنین" میں محقق طوسی کے تذکرہ میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے کچھ ایسا مترشح ہوتا ہے کہ یہ اختلاف شیخ بو علی سینا کے خلاف تھا نہ کہ ارسطو کے۔ غرض عہد اسلام میں منطق کی ترقی رہین منت ہے، متاخرین کے متقدمین سے اختلاف کا یا معاصرین کے حریفانہ تصادم افکار کا جو کسی طرح بھی یونانی منطق کے خلاف بغاوت کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ خود مسلمان منطقیوں کی باہمی چشمک کا نتیجہ تھا۔

وطنی مزاج کی کارفرمائی

ان کے تسامحات کا ایک اور عامل قوی ان کا وطنی مزاج ہے جو افعل التفضیل (Superlative degree) سے کم پر خود کو راضی

نہیں رکھ سکتا۔ مثلاً مسئلہ زمان کو امت مسلمہ کے لیے زندگی
اور موت کا سوال بتاتا:

In the history of Muslim culture on the other hand, we find both in the realm of pure intellect and religious psychology, by which term I mean higher Sufism, the idea, neverless is the possession and enjoyment of the infinite. In a culture with such an attitude, the problem of space and time becomes a question of life and death.[4]

اس قسم کے سخت اور غیر منطقی الفاظ استعمال کرنے سے پہلے
انہیں یہ بھی دیکھ لینا چاہیے تھا کہ ان فقروں کے مضمرات کیا
ہیں اور ان کے دعاوی پر ان مضمرات میں سے کوئی صادق بھی آتا
ہے یا نہیں۔

<u>مخاطبین کی عقیدت پر غیر مشروط اعتماد</u>

ایسا بھی خیال ہوتا ہے کہ انھیں اپنے معاصرن و قارئین کی
عقیدت مفرط پر اور اس سے زیادہ ان کی سہل انکاری اور آرام پسندی
پر بھی بے پناہ اعتماد تھا۔ کون گستاخ ہے جو ان کے ارشادات و
فرمودات میں شک کرے گا اور اگر کرے بھی تو اپنے گونا گوں
مشاغل سے کسے اتنی فرصت ہوگی جو ان دعاوی کی تصدیق کرتا
پھرے یا ان میں مضمر تسامحات کی نشاندھی کے لیے اپنے اوپر
خواب و خور حرام کرکے غیر معروف و غیر متداول ماخذ کی چھان بین
کرتا پھرے۔ مثلاً انھوں نے جہاں مختلف اسلامی علوم کے آغاز و ارتقا
کو یونانی حکمت سے اسلامی ثقافت کی مایوسی و بے اطمینانی کا نتیجہ
بتایا ہے، وہیں ریاضیات میں اس خود ساختہ نظریہ کی کارفرمائی کے سلسلے
میں عجیب گلفشانیاں فرمائی ہیں:

"On the side of Mathematics, it must be renumbered that since the days of Ptolemy (87-165 A. D.) till the time of Nasir Tusi (1201-74 A. D.) nobody seriously thought of the difficulties of

---

(4) Six lectures, p. 184

demonstrating the certitude of Eucled's Parallel Postulate on the basis of peaceptual space. It was Tusi who first disturbed the calm which had prevailed in the world of Mathematics for a thousand years in his efforts to prove the postulate realised the necessity of abondoning perceptual of space. He thus furnished a basis, however slight for the hyper-space movement of our times.[1]

علامہ کا یہ ارشاد گرامی تین دعووں پر مشتمل ہے :

۱۔ دنیائے ریاضیات پر یونانی حکیم و ہیئت دان بطلیموس (Ptolemy) کے زمانے سے جو سکون طاری تھا ، محقق طوسی نے پہلی مرتبہ اس میں تلاطم برپا کیا .

۲۔ انہوں نے اقلیدس کے خطوط متوازی کے مصادرہ (Perallel Postulate) کی صحت کے اثبات کے لیے مکان (Space) کے روایتی تصور کو ترک کرنے کی ضرورت کا احساس کیا .

۳۔ اور پھر اس متبادل نئے تصور مکان کے ذریعہ عہد حاضر کی تضائے کثیرالجہات کی تحریک (Hyper space movement) کا آغاز کیا .

لیکن سخت افسوس ہے کہ اس تبصرہ کے قلمبند کرنے میں علامہ نے اس ذمہداری کو قطعاً نظرانداز کر دیا جس کی اس فاضل سے بجا طور پر توقع کی جاتی ہے جو

"Reconstruction of Islamic Religious Thoughts"

جیسے اہم موضوع پر اہل علم کے مجمع میں تقریر کرنے کے شرف سے نوازا گیا تھا .

۱۔ کاش وہ اس تاریخی حقیقت کو اتنی بیدردی سے نظرانداز نہ فرماتے کہ

(1) Six lectures, pp. 184-185.

"اسلامی عقلیت مسلسل دھارا ہے جو اصولاً تو نزول قرآن کے وقت سے اور عملاً دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفرمنصور (۷۷۵-۷۵۴ھ) کے زمانہ سے ایک مستقل تسلسل کے ساتھ خوبہتر کی تلاش میں بڑھتا رہا ہے۔"

محقق طوسی سے صدیوں پہلے الفضل اسلام کی سعی پیہم سے دنیائے ریاضیات میں بار بار تلاطم آچکا تھا۔

لیکن اگر اس "تلاطم اولین" سے ان کی مراد یہ ہے کہ بطلیموس کے بعد مسلمانوں میں خواجہ نصیرالدین طوسی پہلے فاضل ہیں جنھوں نے اقلیدس کے Parallel Postulate کو ثابت کرنے کی کوشش کی تو یہ ان کی شدید غلط فہمی اور کوتاہیٔ مطالعہ (اصل عربی ماخذ و مصادر سے بےاعتنائی) اور ان سب سے زیادہ مستشرقین پر غیرمشروط اعتماد کا نتیجہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ محقق طوسی سے پہلے متعدد مسلمان ریاضی دانوں نے اس "خطوط متوازی کے مصادرہ" (Parallal Postulate) کو ثابت کرنے کی کوشش کی بھی اور اپنے اپنے خیال میں ثابت بھی کیا۔ ان میں سے تین فاضلوں کا نام اور ان کے کام کی تفصیل محقق طوسی نے اپنے "الرسالہ الشافیہ عن الخطوط المتوازیہ" میں دی ہے اور یہ رسالہ دائرۃ المعارف، حیدرآباد سے شائع ہو چکا ہے اور غالباً اس کا ایک مخطوطہ خود اقبال کے پیش‌نظر بھی تھا مگر انھوں نے اسے پڑھنے کی زحمت نہیں فرمائی۔ بہرحال یہ تین فاضل ہیں، عباس بن سعید الجوہری (زمانہ خلافت مامون‌الرشید یعنی محقق طوسی سے کوئی چارسو سال قبل ابن الہیثم (وفات ۴۳۰ھ کے قریب یعنی محقق طوسی سے کوئی دو سو سال قبل اور عمر خیام (وفات غالباً ۵۲۶ھ یعنی محقق طوسی سے تقریباً سو سال پہلے) بلکہ عمر خیام نے جن مقدمات کی مدد سے اس مصادرہ کو ثابت کیا تھا، محقق طوسی نے ان میں سے دو مقدمہ اپنے وضع کردہ ثبوت میں لے لیے تھے جس کا انھوں نے اعتراف کیا ہے ایک اور چوتھے فاضل بھی ہیں اثیرالدین ابہری (فلسفہ کے متن متین "ھدایۃ الحکمۃ"

کے مصنف) انھوں نے جس طرح اس مصادرہ کو ثابت کیا ہے، اسے قاضی زادہ رومی نے اپنی "شرح اشکال التاسیس" میں نقل کر دیا ہے (شرح اشکال التاسیس کے مخطوطوں کی ایک تعداد ہندوستان اور یورپ وغیرہ کی لائبریریوں میں موجود ہے۔ عرصہ ہوا یہ رسالہ قسطنطنیہ سے شائع ہوا تھا، اس کا ایک نسخہ ہنوز مولانا آزاد لائبریری (عربی مطبوعات کے سیکشن) میں موجود ہے۔ الیرالدین اسدی محقق طوسی کے معاصر متقدم بھی تھے۔ اور ان چاروں فاضلوں کی کوششوں میں جس فاضل کی کوشش دیانتداری کے ساتھ اس تعریف کی مستحق ہے کہ

"اس نے اس سکون میں جو دنیائے ریاضیات پر طاری تھا، تلاطم برپا کیا"

محقق طوسی کے بجائے ابن الھیثم کی کوشش ہے۔ اس نے اقلیدس کے تجویز کردہ مصادرہ کہ :-

"If a straight line cuts two other lines and the two interior angles on one side of the transversal are less than two right angles, the two straight lines, when sufficiently extended will meet one another."

کے بجائے اس کے بدل کے طور پر حسب ذیل مصادرہ پیش کیا

"الخطان المستقیمان المتقاطعان لاھوا زیان خطاً و احداً مستقیما"

(Two intersecting straight lines can not be parallel to one and the same straight line."

اور پھر الھیثم سے آٹھ سو سال بعد برطانوی جیومیٹری داں پلےفیر نے اصول اقلیدس کا جو ایڈیشن مرتب کیا، اس میں اس بدل کو اپنے نام سے داخل کر دیا۔ اگلی صدی میں برٹش سائنس ایسوسی ایشن کے جلسہ میں لارڈ کیلوے نے جو خطبۂ صدارت پڑھا اس میں اس مفصوبہ نئی دریافت کو [جو در حقیقت پلےفیر کا سرقہ تھا]

وقت کی اہم ترین دریافت قرار دیا اور فرمایا :

"My own view is that Euclid's Twelfth axiom in playfair's form of it does not need demonstration, but is part of our notion of space, of physical space of our experience which is the representation lying at the bottom of all external experience."

اس کے بعد یہ فیصلہ کرنا آسان ہے کہ اگر دنیائے ریاضیات میں کوئی تلاطم برپا ہوا تو اس شرف کا مستحق کون ہے، محقق طوسی یا ابن الہیثم۔ مزید تفصیل غیر ضروری ہے۔

۲۔ علامہ کا یہ خیال بھی قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے کہ محقق طوسی نے اس مصادرہ کے اثبات کی کوشش میں مکان کے روایتی تصور کو ترک کرنے کی ضرورت کا احساس کیا۔ مندرجہ ذیل ملحوظات قابل غور ہیں :

(الف) محقق طوسی نے بھی جو اس مصادرہ کا ثبوت دیا ہے، وہ مکان کے روایتی تصور ہی پر مبنی ہے کہ فضا "متشابہ الاجزاء" ہے اور دو نقطوں کے درمیان ایک اور صرف ایک ہی خط مستقیم کھینچا جا سکتا ہے۔

(ب) انھوں نے ارسطاطالیسی، ابن سینائی فلسفہ کے جن متون مثلاً شیخ بو علی سینا کی "کتاب الاشارات والتنبیہات" کی شرح لکھی ہے اس میں بھی ما شاء ماتن کی غرض سے مکان کے ارسطاطالیسی تصور ہی کی مدافعت کی ہے۔ مگر اپنی آزادانہ تحقیق میں وہ ارسطاطالیسی ابن سینائی تصور کے بجائے "بعد مجرد" کے قائل ہیں۔ مگر یہ بھی واضح رہے کہ اس نئے تصور میں بھی ان کی کوئی انفرادیت نہیں ہے اور نہ انھوں نے اسے دریافت کیا ہے۔ ان سے پہلے ابوالبرکات بغدادی اور شیخ الاشراق بھی اسی کے قائل رہے ہیں جیسا کہ ان کے فلسفیانہ افکار کے دانائے راز اور ان کی "تجرالکلام" کے شارح علامہ حلی نے لکھا ہے۔

۳۔ وہی علامہ کی یہ نکتہ آفرینی کہ محقق طوسی نے مکان کے روایتی تصور کو ترک کرکے ایک نیا متبادل تصور پیش کیا

اور اس کے ذریعے عہد حاضر کی فضائے کثیر الجہات (Hyper-Space) کی تحریک کا افتتاح کیا ، انتہائی طفلانہ ہے اور اپنے سامعین اور قارین کی غیر مشروط عقیدت مندی پر اعتماد بیجا کا نتیجہ ہے ۔

واقعہ نفس الامری یہ ہے کہ خطوط "متوازی کے مصادرہ" (Parallel Postulate) کو ثابت کرنے کی کوشش کا (جس کی عہد اسلام میں سب سے آخر میں خواجہ نصیرالدین طوسی نے جرأت کی تھی) انجام نہ تو "غیر اقلیدسی ہندسہ Non-Euclidean Geometry) کی پیدائش کا سبب بنا اور نہ "غیر اقلیدسی مکان" (Non-Euclidean Space) کے تصور کی ابتدا کا ۔ ہاں اس کوشش میں "ناکامی" ضرور اس کا سبب بنی جیسا کہ اطالوی جیومیٹری دان Saecheri جب اس مصادر (Postulat) کو "ثبوت بخلف" (Roduceio od absurdum) کے ذریعہ ثابت کرنے میں ناکام ہوا اور بجائے "باطل" نتائج برآمد ہونے کے معقول اور باہم متوافق (Self Consestent) نتائج کا انکشاف ہوا تو پھر کوئی تین چار سو سال بعد یورپی ریاضی دانوں Riemann, Bolyai and Isbach-evsky نے اس ناکام کوشش کو ازسرنو شروع کیا جس کے نتیجہ میں اقلیدسی نظام ہندسہ ، جیسے متوافق بالذات (Self-Consistent) نظام ظہور میں آئے جو "غیر اقلیدسی ہندسہ" کے نام سے موسوم ہوئے اور پھر مفکرین ریاضیات و طبیعیات نے ان کے لیے "مکان" (Space) کے غیر روایتی تصورات اختراع کیے جو Non-Euclidean Space) کہلاتے ہیں جنھیں بعض لوگ غلطی سے (Hyper-Space) بھی کہتے ہیں ، حالانکہ "Hyper Space" فضائے کثیر الجہات" سے مراد وہم غلط کار کی اختراع کردہ ایسے فضا یا مکان ہے جو تین ابعاد (dimenusion) سے زیادہ ابعاد مشتمل ہو ۔ مزید تفصیل غیر ضروری ہے ۔

مگر سب سے زیادہ معصیت یہ ہے کہ اقبال کی یہ گل افشانیا جن پر ان کے شارحین نے مہر توثیق ثبت فرمادی ہے ، محض "نوائے شاعر" نہیں ہیں ۔ وہ ، نیز ان کے شارحین اور موخرالذکر کے تلامذہ ا

اسلامیات کے متعلق مستند اور ماہر مخصوص سمجھے جاتے ہیں اور اس طرح یہ اغلاط فلسفہ حقائق نفس الامری بن کر نئی نسل کا سرمایۂ علم و حکمت بن رہے ہیں جس کی قباحت مزید تفصیل و توضیح کی محتاج نہیں ہے۔

سنجیدہ طبقہ اس قباحت کو محسوس کر رہا ہے، مگر اس کڑی کمان کو زہ کرنے کی ہمت کون کرے۔ شاید

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند
وما ذالک علی اللہ بعزیز

قنوج کی دو اہم علمی شخصیات
شیخ علی اصغر اور رستم علی قنوجی

ڈاکٹر مسعود انور علوی کاکوروی*

علامہ میر سید غلام علی آزاد بلگرامی (۱۲۰۰ھ/۱۷۸۵ء) ہندوستان کی مردم خیزی پر عموماً اور صوبۂ اودھ و الہ آباد کی مردم خیزی پر خصوصاً تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگرچہ جمیع صوبہ‌جات ہند بہ وجود حاملان علوم تفاخر دارند لیکن صوبۂ اودھ و الہ آباد خصوصیتی دارد کہ ہیچ صوبہ نتوان یافت چہ در تمام صوبۂ اودھ و اکثر صوبۂ الہ آباد بہ فاصلہ پنج کردہ نہایت دہ کردہ تخمیناً آبادی شرفا و نجباست کہ از سلاطین و حکام وظائف و زمین مدد معاش داشتہ اند و مساجد و مدارس و خانقاہات نبانہادہ و مدرسان عصر در ہرجا ابواب علم بر روئے دانش پژوہان کشادہ وصلائے اطلبوالعلم درواده و طلبۂ علم خیل خیل از شہرے بہ شہرے می روند و ہرجا موافقت دست بہم داد بہ تحصیل مشغول می شوند و صاحب توفیقات ہر معمورہ طلبۂ علم رالگاہ می دارند و خدمت ایں جماعت را سعادت عظمی می دانند"[۱].

(اگرچہ ہندوستان کے تمام صوبے صاحبان علم کی وجہ سے لائق فخر ہیں لیکن اودھ و الہ آباد کا صوبہ جس خصوصیت کا حامل ہے وہ کسی دوسرے صوبہ کے حصہ میں نہ آسکی. صوبہ اودھ کے سبھی مقامات اور الہ آباد کے اکثر مقامات پر ۵ سے ۱۰ کوس کے فاصلہ پر شرفا و نجبا کی بستیاں ہیں جو سلاطین و حکام وقت سے وظیفے و جائدادیں پائے ہوئے ہیں. وہاں مسجدیں اور

---

* ڈاکٹر مسعود انور علوی کاکوروی، ریڈر، شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ.

مدرسے اور خانقاہیں قائم ہیں جہاں اہل علم و دانش درس و تدریس اور افادہ میں مصروف رہتے ہیں۔ دور دراز اور قرب و جوار سے طالبان علم ان علم کے سرچشموں سے آآ کر فیضیاب ہوتے رہتے ہیں۔ اہل ثروت و صاحبان توفیق ان طلبہ کی نگہداشت کرتے اور ان کی خدمت اور ان مراکز کی سرپرستی کو اپنے لیے بڑی سعادت سمجھتے ہیں۔

جب ہم عہد وسطیٰ اور اس کے بعد کی ہندوستانی تاریخ کا عمومی جائزہ لیں تو علامہ بلگرامی کے اس بیان کی مزید توثیق ہو جاتی ہے۔ شاید اسی ماحول کا یہ اثر تھا کہ ہندوستانی علما نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ملک بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہے۔ ان صاحبان کی بساط درس پر جن لوگوں نے زانوئے تلمذ تہ کیا ان میں سے بہت سے دیار عرب میں بھی مستند مانے گئے۔

اودھ کے جو خطے اپنی مردم خیزی، علماء سازی اور فن پروری میں مشہور رہے ہیں ان میں ایک قنوج بھی ہے جو قدیم زمانہ میں بھی علما و مشائخ کا مخزن رہا ہے۔ یہاں ایک عرصہ تک علماء فضلا اور ارباب دانش پیدا ہوتے رہے۔ صاحبان کمال کی ایک طویل فہرست ہے، جن میں شیخ حبیب‌اللہ قنوجی، سید آل حسن، احمد حسن، شیخ علی اصغر، شیخ رستم علی، شیخ عبدالباسط، سید محمد قنوجی، علیم‌الدین قنوجی، نواب سید صدیق حسن خاں صاحبان جیسے حضرات سر فہرست ہیں۔

شیخ علی اصغر صدیقی قنوجی اپنے عہد کے ایک باکمال عالم، صاحب تصانیف صوفی بزرگ تھے جن کا سلسلۂ نسب "فصول عمادیہ" کے مصنف شیخ عمادالدین کرمانی سے ہوتا ہوا حضرت سیدنا صدیق اکبر تک پہنچتا ہے۲۔ شیخ علی اصغر بن شیخ عبدالصمد صدیقی کے آبا واجداد امتداد زمانہ سے حجاز مقدس کی سر زمین چھوڑ کر کرمان (ایران) جا بسے تھے، وہاں سے ان کے اخلاف میں شیخ مبارک صدیقی ہجرت کرکے ہندوستان آئے اور بعد میں قنوج میں اقامت پذیر ہو گئے۔

بھی سے ان کا خاندان پھیلا اور بیشتر افراد قنوج ہی میں رہ گئے۔ شیخ علی اصغر قنوجی کے خاندان میں یہ خصوصیت رہی ہے کہ ان کے اخلاف میں پانچ پشتوں تک بلا فصل ارباب علم اور صاحبانِ تصانیف پیدا ہوتے رہے۔ وہ ۱۰۵۱ھ/۱۶۴۱ء کو قنوج میں متولد ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سید محمد حسینی سے حاصل کی پھر مزید تعلیم ملا محمد زمان کاکوروی، ملا عصمت اللہ سہارنپوری، نواب دیانت خاں اور مولانا لطف اللہ کوڑوی سے حاصل کی۔ "تذکرہ علمائے ہند" کی روایت کے مطابق فاتحۃ الفراغ ملا محمد زمان کاکوروی سے پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۲۔

شیخ علی اصغر علم ظاہری کی تکمیل کے بعد چونکہ انہیں تصوف و سلوک سے فطری مناسبت اور شوق تھا اس وجہ سے سلسلہ چشتیہ کے بزرگ حضرت شاہ پیر محمد لکھنوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اذکار و اشغال اور اوراد و وظایف کی تعلیم حاصل کی ان سے بیعت ہوئے اور پیر و مرشد کے ہمراہ "اربعینات" چلوں میں بیٹھے اور خلق خدا کی خدمت، تدریس و درس، افادہ اور تزکیہ نفس میں مصروف ہو گئے۔ اور آخر عمر تک تصنیف و تالیف اور درس و تدریس میں منہمک رہے۔ آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ وہ مسلسل سالہاسال درس و تدریس میں مشغول رہے اور بکثرت لوگ ان کی بساط درس سے فیضیاب ہوئے۳۔

انہوں نے ۱۵ شعبان ۱۱۴۰ھ/۱۷۲۷ء کو قنوج میں وفات پائی اور اپنی مسجد کے سامنے چبوترہ پر مدفون ہوئے۔ علامہ آزاد بلگرامی نے جو ان کی ملاقات سے مشرف ہو چکے تھے اور ان کی مقدس شخصیت کے معرف بھی تھے تاریخ وفات کہی:

مولوی زماں علی اصغر　　از وفاتش کمال شد معدوم
سال تاریخ او نوشت خرد　　شد نہاں آفتاب صبح علوم ۵
۱۱۴۰ھ

تاریخ و تذکرہ کی کتابوں سے شیخ قنوجی کے دو صاحبزادوں ۱- مولانا محمد کامل (م ۱۱۳۹ھ/۱۷۲۶ء) ۲- شیخ رستم علی

(م ۱۱۶۸ھ/۱۶۹۳-۱۷۵۵ء) کا پتہ چلتا ہے۔ شیخ موصوف نے متعدد کتابیں لکھیں اور بقول ان کے ہم وطن نواب صدیق حسن خاں قنوجی کے :

در علم سلوک و تصوف کتابہا دارد هم در نثر و هم در نظم و تفسیرے نوشتہ بغایت متین و مختصر و نامش "نوالب التنزیل" است۹ .

تصوف و سلوک میں ان کی بہت سی نثری و منظوم تخلیقات ہیں انھوں نے ایک مختصر و جامع تفسیر بھی "نوالب التنزیل" کے نام سے لکھی ہے ۔

تصانیف :- ان کی اکثر تصانیف کے نام کتابوں میں ملتے ہیں۔ تفسیر نوالب التنزیل فی الادۃ التاویل کا ایک نا مکمل نسخہ رضا لائبریری رامپور میں ۹۰ صفحات پر مشتمل موجود ہے۔ اب تک راقم الحروف کے علم میں اس کے کسی دوسرے نسخہ کی موجودگی کہیں نہیں ہے ۔

مخطوطہ کی ابتدا اس طرح ہے :

الحمد لله العليم الحكيم الذى انزل على عبده كتاباً فاتحة السبع المثانى و القرآن العظيم و متيمنا بالسبع الطوال و الحواميم لما كانوا مستعجلين و ليشوائع الاقتراح مقرحين الى ان ابرزلهم اولا تفسير الفاتحة فى مختصر عنده ليكون لهم مناراً يتهمونه و مثالا يقتد و نه ."

باوجود اس کے کہ تفسیر ہمارے سامنے نامکمل شکل میں ہے مگر پھر بھی یہ بہت سی خوبیوں کی حامل ہے اور ہندوستانی مفسرین کے شاہکاروں میں شمار کی جانے کے لائق ہے۔ تفسیر کے مطالعہ سے مفسر کی علمیت، فقہی نکتہ رسی، دقت نظری کلام پاک سے شغف اور بصیرت کا پتہ چلتا ہے ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد سورۂ فاتحہ کی پندرہ صفحات پر مشتمل تفسیر ہے جس میں اس کے معانی و مطالب کی تشریح و

توضیح اور سورہ کی اہمیت اور مفہوم کی تفہیم اور ضرورت کو بیان کیا ہے اور ازاں اعجاز قرآن سے متعلق مندرجہ ذیل سات مسائل پر بحث کی ہے۔

پہلا مسئلہ نزول قرآن کا ہے، دوسرا یہ کہ حضرت جبرئیل کتنی مقدار میں قرآن لاتے تھے۔ تیسرے مسئلہ میں بتایا ہے کہ وحی کے نزول کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا کیفیت ہوتی تھی۔ چوتھا مسئلہ مکی اور مدنی آیات سے متعلق ہے۔ پانچواں مسئلہ نزول قرآن کی ترتیب کے سلسلہ میں ہے اور چھٹا مسئلہ جمع اور تدوین و ترتیب قرآن سے متعلق ہے۔ نیز ساتواں ان سات حروف کی تحقیق کے بارہ میں ہے جن کی بنیاد سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کے قول مبارک ''نزل القرآن علی سبعۃ حرف'' پر ہے۔ بعد ازاں آلم اور بعض دوسرے حروف مقطعات کی تفسیر کے سلسلہ میں لکھا ہے:

"معلوم ہونا چاہیئے کہ حروف مقطعات سورتوں کی ابتدا میں متشابہات کی قسم سے ہیں اور اللہ تعالی کے سوا کسی کو ان کا علم نہیں ہے جیسا کہ کہا گیا ہے کہ ہر کتاب کا ایک راز ہے اور کلام پاک کا راز سورتوں کے ابتدائی حصے (حروف مقطعات) ہیں۔"

مفسر نے اس تفسیر کو سات ثواقب میں تقسیم کیا تھا۔ پہلا ثاقبتہ سورہ فاتحہ سے متعلق ہے، اس کے بعد سورۂ بقر اور سورۂ آل عمران کو دوسرے ثاقبتہ میں رکھا مگر افسوس کہ مذکورہ نسخہ ذالک الکتاب کے بعد اس عبارت پر ختم ہو جاتا ہے۔

ذلک اشارۃ الی آلم المذکور قبلہ....بالمولف من ھذہ الحروف

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ شیخ قنوجی کی دوسری تصانیف کی موجودگی کا پتہ نہیں چلتا۔ ڈاکٹر زبید احمد

مرحوم نے بھی اپنی تحقیقی کاوش

"The Contribution of India to Arabic Literature"

میں ان کی تصانیف کی موجودگی کا کہیں تذکرہ نہیں کیا ہے۔

حسن اتفاق ہے راقم الحروف کو قنوجی کے چھ مصنفات کے مطالعہ کا شرف، کتب خانہ الوریہ، خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کاکوری ضلع لکھنؤ میں حاصل ہوا۔ یہ گراں قدر مخطوطات شیخ قنوجی کی عربی زبان میں قابلیت اور تصوف کے سلسلہ میں ان کے ذہنی رجحان اور فطری میلان کی طرف بھی رہنمائی کرتے ہیں۔ قارئین کی دلچسپی اور معلومات کے خیال سے ان تخلیقات کا اجمالی تعارف درج کیا جا رہا ہے۔

۱ - شیخ اکبر محی الدین ابن عربی (۶۳۸ھ/۱۲۴۰ء) کی مشہور رسالہ تصنیف فصوص الحکم کی شرح جو جوامع الکلم کے نام سے ہے۔ یہ مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں ہے۔

۲ - تبصرة المدارج : اس مخطوطہ میں کل ۸۳ صفحات ہیں۔ ہر صفحہ میں ۱۷ سطریں۔ خط نستعلیق و شکست ہے، کاتب کا نام درج نہیں ہے مگر پہلے ہی صفحہ پر عبدالباسط بن رستم علی بن شیخ علی اصغر قنوجی کی مہر ہے۔

ابتدا اس طرح ہے: سبحان من ستر الحقیقة الکاملة باظهار الخصوصیة الشاملة و جعل الدلیل علی معرفة الیائه و اولیائه من حیث الدلیل علیه و ادخل الیه وهم فی حجاب النسبة معذورون حتی قال فی حقهم لاخوف علیهم ولاهم یحزنون۔

حمد و صلوۃ کے بعد اپنے شیخ طریقت حضرت شاہ پیر محمد لکھنوی کی شان میں رقم طراز ہیں:

......عند ذکر المقامات، احوال الکمل من الواصلین و مقالات الشیوخ الماضین مع بعض ما استفدته من حضرة الامام الاوحدی جلیل لواء

السمنانی، قطب فلک الولایة و مرکز دائرة الهدایة بحرالحقیقة و سید الطریقة شیخنا و شیخ الاسلام میر عبدالقوامی و البوام المطلب بن عبدالله بسلطان الاولیاء المعروف بشیخ میر محمد بن اولیا البحر کلوری، المولد و الکهنوی المحتد ادام الله اثاره علی صفحات الایام و الیالی المولوه ؤاهرة بین الثلم. اس کے بعد رسالہ کی غرض و غایت، وجہ تسمیہ، اس کے محتویات و مشغلات کے بیان کے بعد سالک کے لیے لازمی امور کا تذکرہ ہے۔ بعد ازاں اخذ لیض، تشکر، مقام توبہ، صبر، زھد، سلوک کے فوائد، تواضع، توکل، رضا، محبت، حیا، شوق، انس، خوف، رجاء، فقر، وصل اور دیگر مقامات و کیفیات کا ذکر کرنے کے بعد سالک کو راہ سلوک اور کرامات کے مقام پر پہنچنے پر جو شیطانی وسوسے اور خیالات آتے ہیں ان کا بیان ہے۔ آخری عبارت یہ ہے:-

هذا ما تیسر لنا بمقتضی الحال و لم یمل علی کلسی لیه آل کلی المقال لئلا یفضی الی الملال.......... اسئله ان ینفعنا و ایاک به فانه الیه المرجع و المآب۔"

۳- اللطائف العلیه فی المعارف الالٰهیه: یہ مخطوطہ نو سو بائیس صفحات پر مشتمل ہے، فی صفحہ ۲۷ سطریں ہیں۔ صفحہ اول پر عبدالباسط قنوجی کی عبارت درج ہے، پتہ چلتا ہے کہ یہ مخطوطہ ان کی ملک رہا ہے۔ لیکن اغلب یہ ہے کہ یہ نسخہ بخط مولف ہے۔ صفحہ اول پر ۱۱۳۷ھ مرقوم ہے۔ یہ تصنیف شیخ اکبر محی الدین ابن عربی (م ۶۳۸ھ/۱۲۴۰ء) کی مشہور زمانہ، معرکۃ الآراء تصنیف "فصوص الحکم" کے طرز پر ہے۔ یہ کتاب چار ابواب اور ایک مقدمہ و خاتمہ پر مشتمل ہے۔

ابتدا اس طرح ہے:

الحمد لله الذی خلقکم وما تعملون عالم الغیب و الشهادة تعالی عما یشرکون به وجد نا ما وجدنا و حمد بکل ما حمد هوالاول و الآخر فمنه الابتداء والیه الا نتهاء، هوالظاهر و الباطن بعد ماظهر و مابطن من الأشیاء.

مقدمہ میں سالکین کے لیے مقامات سلوک اور احوال کے سلسلہ میں جن رموز و نکات اور تنبیہات کی ضرورت ہوتی ہے ان کا بیان ہے۔ پہلے باب میں وجود باری اور اس سے متعلق مباحث کا بیان ہے، دوسرا باب ایجاد عالم کے سلسلہ میں اور تیسرا و چوتھا تنزلات و تنزہات کے سلسلہ میں ہیں۔ تیسرے اور چوتھے باب کو بھی تقسیم کیا ہے، مثلاً تیسرے باب کا پہلا حصہ تنزلات کے وجودی مراتب کے بارہ میں اور دوسرا وجود امکانی کے مراتب کے سلسلہ میں ہیں۔ خاتمہ کتاب میں ان تمام 'لطائف' کا بیان ہے جن کا تعلق ''نشاۃ اخرویہ" سے ہے۔

کتاب کی آخری عبارت یہ ہے:

احیانا اللہ علی ملتھم و اماتنا علی سیرتھم و احشرنا فی زمرتھم و جعلنا منھم و معھم و من اجھم و اتبعھم۔

م۔ القصیدہ النعتیہ: یہ عربی نعتیہ قصیدہ نواسی اشعار پر مشتمل ہے۔ جابجا فارسی میں حواشی بھی ہیں۔ صفحہ اول پر بالترتیب تین مہریں عبدالباسط بن رستم علی قنوجی، رستم علی بن علی اصغر قنوجی ۱۱۳۱ھ، علی اصغر بن عبدالصمد قنوجی ۱۱۰۱ھ ہیں۔ چوتھی مہر ''یا باسط" ہے اس کے نیچے "مالک ابن کتاب عبدالباسط" لکھا ہے نیز عبدالباسط قنوجی کی تحریر ہے۔ ''نسخۂ قصائد تصنیف ملا علی اصغر قنوجی" اس تحریر کے زیریں حسب سابق یہ عبارت مرقوم ہے "المالک ھو اللہ سبحانہ لکنہ بفضلہ....

قصیدہ کے ابتدائی اشعار یہ ہیں:

یا مظہر الاسم الأتم یا مصدر الوصف الاسم

ترجی برأفتک الھدی تمحی برحمتک الظلم

یدعیک اسقاط التعب ولدیک من سلع الادب

لبیک من اھل العرب سعدیک من اھل العجم

انت النبی المصطفی انت الأمین المقتدی

بدر الدجی صدر العلیٰ لیث الوغیٰ غیث الکرم

آخری اشعار یہ ہیں :

انوار اعلام الهدایة تهتدی بجنا بهم کل عرانین العرب کل صنادید العجم
کانو اجوا را للفضائل و المعارف جمة استخرجت منها اللآلی الحقایق و الحکم

۵ - القصیدۃ المهمیۃ فی النفحۃ المحمدیۃ: اکسٹھہ صفحات پر مشتمل اس قصیدہ میں ایک سو تراسی اشعار ہیں۔ حواشی پر ان اشعار کے مشکل الفاظ کی تشریح و توضیح ہے۔ اس قصیدہ کا خط بھی مذکورہ بالا قصیدہ جیسا ہے۔ اشعار تصوف کے رنگ میں ہیں۔ اشعار پر لکھے ہوئے حواشی عربی میں ہیں۔

قف خلیلی بالمطایانا و تلقاء الحمٰی ان تری فیها القباب.. عرج لعلما
ان و ملت الوقت بین من حقایق قلبه بالتادب فی مقام العطف من حسن الاوا
فی الحقیقة لیس لی من عاذل فی حبها انها مشغولة کالشمس فی بسط الضوا

نعتیہ اشعار کے بعد عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خیر القرون ہونے اور صحابہ کرام کے فضائل و مناقب کا بیان ہے۔

اسعد الازمان فی الدنیا قرون الانبیاء سیما القرن الذی فیه عهد مصطفیٰ
حبذا عهد الصحابة انهم خیرالوریٰ حبذا من کان فی عهدالنبی المصطفیٰ

آخری شعر یہ ہے :

قال اصحابی لکم مثل النجوم بایهم اقتد یتم اهتدیتم کلهم عین الهدیٰ

ایک تیسرا قصیدہ اسی ضمن میں ایک سو آٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ قصیدہ مذکورہ بالا دونوں قصائد کے ساتھ مجلد ہے۔ تینوں قصائد کا خط یکساں اور نستعلیق ہے۔ قیاس یہی ہے کہ یہ نسخہ بھی بخط شاعر (مصنف) ہے۔

اشعار میں اخلاص و نیازمندی، تصوف کے حقایق و معارف، رموز و نکات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں نعتیہ اشعار، عشق و محبت رسول جو تصوف اور ارباب تصوف کے لیے لابدی ہیں

ان سب کا بیان ہے۔ حاشیہ پر جابجا مشکل الفاظ اور اصطلاحات کی تشریح و توضیح بھی کی ہے۔

ابتدائی اشعار یہ ہیں:

احمد اللہ الموفق للحمد و الرضا احمد اللہ الطاہر وجهه سائل القضا
الحکیم المظہر الاسما لوجه القضی القدیر الواهب الآلاء سائل هیبته
لایؤدی حمده التشبیه والتنزیه بل حمده ما قال خیرالخلق لا احصی لنا

بعض اشعار پر حواشی بھی لکھے ہیں۔ مثلاً مندرجہ ذیل شعر پر یہ حاشیہ لکھا ہے:

اذکر و اما اعطیکم من و جوبات الوجود
ما اجبتم من الست وبکم من وبنا

"قال اللہ تعالی خذ و اما آتیکم بقوة و اذکرو اما فیه لعلکم تتقون۔ ای اذکرو اما اجبتم الاقرار بالربوبیة فعلیکم السعی فی حصول مراتب مرضیاته، قوله و اذ اخذ ربك من بنی آدم من ظهر هم ذریتهم و اشهد هم علی انفسهم الست بربکم قالوا بلی، شهدنا ان تقولو یوم القیامة انا کنا عن هذا غافلین۔"

نیة الا خلاص فی طاعاته خیر لکم انما الا عمال بالنیات قال المقتدی

آفات و بلیات اور مصائب و آلام میں نبی کریم کی ذات اور ان کے وسیلہ کو۔ اہم و لازمی قرار دیا اور آپ کی محبت و اطاعت کو عین ایمان معلوم کیا ہے۔

قصیدہ کا یہ آخری شعر سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے:

سلموا یا قومنا صلوا علی خیرالوری وحمة للعالمین ماجاء الا مصطفی

۶۔ النفائس العلیة فی کشف اسرار السبعینیة: یہ "القصیدة السبعینیة فی الشطة النفسانیة" کی شرح ہے۔ جو انگلستو چوٹنیکی مقاصد

پر مشتمل ہے۔ مصنف نے اپنے بعض اشعار کی شرح مبسوط و مفصل بسط سے کی ہے اور بعض اشعار میں اختصار کو پیش نظر رکھا ہے صرف مطلع کی شرح تین صفحات پر مشتمل ہے۔ مخطوطہ بخط نستعلیق شکستہ ہے۔

صفحہ اول پر حسب سابق مہریں ہیں۔ عبدالباسط قنوجی کی مہر کے نیچے ان کی تحریر ہے شرح کی ابتدا اس طرح ہے:

منه ما بدأ ما نظم في عقد التقدير القضا و دامن دابد الاهو انا بنا صيغها، طوبى لمهدى منهم السالكين من خزائنه اجود و الهدى سبه نبينا و رسولنا بهدى المصطفى المخصوص بقرب قاب قوسين او ادنى و لمقتضى آثاره الذين بهم وصل العارفون الى معارج العلى و نال المتقون في مجاهد اتهم الى مكان زلفى و بعد فيقول العبد المفتقر الى الله الغني على اصغر بن عبدالصمد القنوجي البكرى الكرمانى...

بعض اشعار کی تشریح میں اختصار کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے۔ مثلاً صحابہ کرام کے فضائل و مناقب میں آخری دو اشعار کی تشریح اس طرح کی گئی ہے:

بالنسب كانوا قرانين العرب في اصلهم
بالفضائل كلهم كانوا صناديد الورى

شرح:- القرانين جمع القرن بالكسر و هوالرئيس، و الصناديد جمع صنديد و هو رئيس القوم و اشرافهم و انما كانوا بالنسب قرانين العرب لان كبار الصحابة كانوا من قبيلة قريش و هى اشرف و اعظم من قبائل العرب و فضائلهم ثبتت بالاخبار المتواترة و المشاهير فكانوا صناديد الخلائق كلهم في العلوم و المعارف.

قال اصحابى لكم مثل النجوم بايهم اقتديتم كلهم عين الهدى

لقوله صلى الله عليه وسلم قال " اصحابى كالنجوم بايهم اقتديتم اهتديتم" و الهدى مصدر كالتقى اطلق عليهم مبالغة...

شیخ رستم علی قنوجی :- شیخ ابو عبداللہ محمد رستم علی قنوجی اپنے والد کے چھوٹے بیٹے تھے۔ ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء کو قنوج میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کے آغوش تربیت میں پروان چڑھے اور مختصرات سے متوسطات تک تمام کتابیں ان ہی سے پڑھیں اور ان کی وفات کے بعد لکھنؤ گئے اور فاتحۃ الفراغ، بانی درس نظامی ملا نظام الدین فرنگی محلی (۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) سے پڑھا بعد ازاں قنوج واپس آگئے اور اپنے والد ماجد کی طرح درس و افادہ میں مصروف ہو گئے۔ ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۳ء میں اپنے بڑے بھائی مولانا محمد کامل قنوجی سے سلسلہ نقشبندیہ کی اجازت حاصل کی۔ آخر عمر میں جب قنوج پر مرہٹوں کا قبضہ ہوگیا تو فرخ آباد چلے گئے۔ حافظ رحمت خاں کی دعوت پر کچھ دن فرخ آباد رہ کر بریلی چلے گئے۔ حافظ رحمت خاں نے بڑا اعزاز و اکرام کیا۔ بریلی میں مقیم تھے کہ پروانۂ اجل آگیا اور ۱۱۷۸ھ/۱۷۶۴ء میں وہیں وفات پائی۔ نعش قنوج لائی گئی اور والد ماجد کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

منتخب نورالانوار "شرح منارالانوار" اور "التفسیر الصغیر" جو اختصار میں "جلالین" کے ہم پلہ ہے ان کی قابل ذکر تصانیف ہیں۔

اول الذکر تصنیف کا ایک قلمی نسخہ ندوۃ العلماء، لکھنؤ کے کتب خانہ (۶۱ اصول فقہ) میں محفوظ ہے۔ "التفسیر الصغیر" کے اب تک صرف دو نسخوں کا علم راقم کو ہوا ہے۔ پہلا نسخہ کتب خانہ انوریہ، خانقاہ کاظمیہ قلندریہ، کاکوری، ضلع لکھنؤ میں موجود ہے جو صرف ساڑھے چار پاروں کی تفسیر ہے اور نامکمل ہے۔ دوسرا نسخہ مکمل اور عمدہ ہے اور مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کلکشن عربیہ منتخب (۱) ۲۲ میں محفوظ ہے۔

مذکورہ مکمل نسخہ میں کل چار سو تیس صفحات ہیں۔ ہر صفحہ میں اکیس سطریں ہیں۔ بہت خوشخط اور خط نستعلیق میں ہے۔ قرآنی آیات خط کشیدہ ہیں۔ سورتوں کے اسماء نفی سرخ روشنائی سے لکھے ہیں۔ جابجا فارسی میں حواشی ہیں۔ ابتداء میں ایک فہرست بخط شیخ ...

خوش خط شامل ہے۔ یہاں ہی صفحہ پر المالک الحقیقی ہواللہ و بالمجاز عبدالرشید ولد مولوی دین محمد عفااللہ عنہ مرقوم ہے۔ بعض طبی نسخہ جات درج ہیں۔ سورۂ فاتحہ کا نقش، تعویذات و عملیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت میلر کہ کے واسطے ایک مجرب نماز کا عمل وغیرہ مندرج ہیں۔ ابتدائی صفحات پر مولانا محمد سلامت اللہ فرنگی محلی، مولانا انوارالحق وغیرہ کی مہریں اور مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی کے دستخط ہیں۔ حواشی پر جابجا تفسیر حسینی، منتخب اللغات، شاہجہانی وغیرہ کی مدد سے فارسی زبان میں الفاظ کی تشریح بھی ہے۔ یہاں مختصراً اس نادر و اہم تفسیر جو اپنے اختصار و ایجاز میں جلالین سے ہم پلہ ہے کا ایک تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔ تفسیر کی فہرست اس طرح درج ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ سورۃ الفاتحۃ، الجزء الاول آلم سورۃ البقرۃ، الجزء الثانی سیقول الجزء الثالث تلک الرسل، سورۃ آل عمران، الجزء الرابع لن تنالوا طاہر، سورۃ النساء، الجزء الخامس و المحصنات الجزء السادس لایحب اللہ سورۃ المائدۃ۔ الجزء السابع و اذاسمعوا سورۃ الانعام، الجزء الثامن ولواننا سورۃ الاعراف، الجزء التاسع قال الملأ سورۃ الانفال، الجزء العاشر و اعلموا سورۃ البراءۃ۔۔

ابتدا اس طرح کی ہے:

الحمد للہ الذی انزل علی عبدہ الکتاب شفاء و رحمۃ بشیراً و نذیراً و صلی اللہ علی سیدنا و مولانا محمد و علی آلہ و صحبہ وسلم تسلیما کثیراً کثیرا۔ و بعد۔ فیقول العبد الضعیف المفتقر الی رحمۃ ربہ الغنی ابو عبداللہ محمد بن علی اصغر القنوجی صانہ عماشانہ لما کان علم التفسیر الذی عرفوہ بانہ علم الحرف بکتاب اللہ المنزل علی نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم اشرف العلوم لشرف موضوعہ الذی ہوالعروۃ الوثقی و غایۃ التی ہی السعادۃ القصوی۔ فالاشتغال بہ افضل الاشتغال للاخرۃ و الاولی۔ فانامع قلۃ بضاعتی و عدم طاعتی و ایضا اردت تفسیرا صغیرا ینجح حاجتی عند قراءتی و تلاوتی لیکون وسیلۃ الی رضوانہ فی دنیای و آخرتی رب اشرح لی صدری و یسرلی امری و اہدنی الی طریق الحق و الصراط

المستقيم و زدني علماً نافعاً في السبع المثاني و القرآن العظيم و صنك الرمائد و الهداية في البداية و النهاية انك انت حسبي و نعم الوكيل نعم المولى و نعم النصير . ولاحول ولا قوة الا بك .

(تمام تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندہ پر وہ کتاب نازل فرمائی جو بیماروں کے لیے شفاء ، گناہگاروں کے لیے رحمت اور انسانوں کو جنت و دوزخ کی خبر دینے والی اور اللہ کے عذاب سے ڈرانے والی ہے ۔ اور درود و سلام ہو ہمارے آقا و مولا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل اور اصحاب پر .
اما بعد یہ کمزور بندہ ، اپنے غنی رب کی بارگاہ میں اس کی رحمت کا محتاج ابو عبداللہ محمد بن علی اصغر قنوجی ، اللہ تعالی اس کی حفاظت فرمائے ، کہتا ہے کہ تفسیر کا علم جو اللہ تعالی کی نازل کردہ کتاب کی معرفت اور پہچان کا علم ہے وہ اپنے موضوع کے اعتبار سے سب سے بزرگ و برتر علم ہے . وہ مضبوط گرہ اور وہ مقصد اصلی ہے جو انتہائی سعادت ہے ، علم تفسیر میں مشغولیت اور انہماک دونوں جہان میں سب سے بہتر امر ہے . میں نے اپنی بے بضاعتی اور نا فرمانی کے باوجود یہ چاہا کہ ایک ایسی مختصر تفسیر لکھوں جو کلام پاک کی تلاوت کے وقت میری حاجت روائی و راہنمائی کرے اور دنیا و آخرت میں اللہ تعالی کی رضا و خوشنودی کا ذریعہ بنے . اے میرے رب میرے واسطے سینے کو کھول دے میرا معاملہ میرے واسطے آسان فرما اور حق کے راستے کی جانب میری ہدایت فرما اور میرے لیے مفید اور نفع بخش علم ارزانی فرما قرآن پاک میں تیری ہی جانب سے مدد اور اول و آخر ہدایت ہے . یقیناً تو میرے لیے بہت کافی ، بہترین وکالت کرنے والا مولا و مددگار ہے .
لا حول ولا قوة .)

حمد و نعت کے بعد علم تفسیر کی اہمیت اور اس کی قدر و منزلت کا بیان ہے . بعد ازاں یہ کہ قرآن پاک لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر شب قدر میں نازل کیا گیا . اس میں ۱۱۴ سورتیں اور ۶۶۶۶ آیتیں ہیں . ان میں ۵۰۰ آیات احکام سے متعلق ہیں اور باقی میں قصے ، دعا و

گناہ وغیرہ ہیں۔ ان آیات کی ترتیب خود سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے بحکم الٰہی فرمائی۔ سورہ فاتحہ کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ یہ سات آیات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے سبع مثانی کہی جاتی ہے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، سورہ فاتحہ کا جزو نہیں ہے بلکہ ایک آیت ہے جو سورتوں کے درمیان فرق کرنے کی بنا پر نازل ہوئی ہے۔ رب العلمین کے ضمن میں اس بات کا بیان ہے کہ ایک ہزار عالم ہیں جن میں سے چھ سو سمندر میں اور چار سو خشکی پر ہیں۔ یہ دنیا ان میں سے ایک ہے۔

سورہ فاتحہ کی تفسیر اس طرح کی ہے:

هی السبع المثانی لا نه سبع آیات تثنی فی کل صلوٰة و یقدر فی اولها قولو لیکون مناسباً لایاک نعبد. بسم الله الرحمٰن الرحیم لیست جزءامن الفاتحة وغیرها بل آیة انزلت للفصل بین السور. الحمد لله رب العلمین العالم هوالخلق لا نه علامة على موجده و جمعه بالیاء و النون بتغلیب العقلاء على غیر هم یشتمل ابعاضه. وقیل هی الف عالم ستمائة فی البحر و اربعمائة فی البر وقیل ثمانیة عشر الف الدنیا عالم منها و الحق أنه لم یحصر عدده أحد من العلمین ولا یعلم جنود ربک الاهو.

الرحمٰن الرحیم کی شرح میں فرماتے ہیں: "له سبحانه رحمتان، رحمة امتنان کماورد رحمتی و سعت کل شئی و هو ناظر الى ذاته و رحمة و جوب کما قال فسا کتبها للذین یتقون و هو ناظر الى اعمال عباده..."

یعنی اس پاک پروردگار کی دو رحمتیں ہیں۔ ایک احسان کی رحمت جیسا کہ وارد ہوا ہے کہ "میری رحمت ہر چیز پر محیط ہے۔ اس طرح وہ اپنی ذات کی جانب ناظر ہے۔ اور دوسری وجوب کی رحمت جیسا کہ فرمایا ہے کہ میں ان لوگوں کے لیے اس کو مقرر کروں گا جو مجھ سے ڈرتے ہیں، اس میں وہ اپنے بندوں کے اعمال و افعال کا ناظر و شاہد ہے۔"

مفسر نے اس باب کا خاص التزام کیا ہے کہ قرآن مجید میں مسائل سے متعلق آیات میں امام اعظم ابو حنیفہ اور امام ادریس شافعی کے مسلک کو بیان کیا ہے۔ دقت پسندی اور طوالت سے اپنے کو بچایا ہے اور بڑی بڑی آیات کی تشریح و توضیح بھی تشبیہات سے

بچے ہوتی کی ہے تاکہ قاری اصل مطالب سے باخبر ہو جائے اور نفس مطالب سے واقفیت کے بعد مزید معلومات کے طالبین طولانی تفاسیر کی جانب رجوع کریں۔ ساتھ ہی کلام پاک میں جہاں جہاں قصے اور واقعات بیان ہوئے ہیں، ان کی تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے صرف ضروری حد تک تحریر کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ مثلاً حضرت مریم کی پیدائش اور پرورش و پرداخت کے سلسلہ میں لکھا ہے:

"روی أنها لما ولدتها امها حملتها الی المسجد عند الاحبار قالت خذوا هذه النذيرة فرغبوا فيها جميعا لانها كانت بنت امامهم، فقال زكريا انا احق بها عندى خالتها فابوا الا بالقرعة و كانوا سبعة و عشرين فانطلقوا إلى النهر فالقوا فيه اقلامهم فطفى قلم زكريا فتكفلها و بنى لها غرفة بسلم لايصعد غيره."

یعنی روایت کی گئی ہے کہ جب ان کی ماں نے ان کو جنا تو وہ انہیں لے کر مسجد میں احبار (علماء) کے پاس آئیں اور کہا کہ اس کو لو تو تمام کے تمام ان کے لینے کو بڑھے کیونکہ وہ ان کے امام کی بیٹی تھیں۔ حضرت زکریا نے کہا کہ میں زیادہ حقدار ہوں کیونکہ وہ خالو تھے تو انہوں نے انکار کیا اور قرعہ پر بات آئی۔ وہ لوگ تعداد میں ستائیس تھے۔ سب دریا کی طرف گئے، ہر ایک نے اپنا قلم جس سے وہ توریت لکھتے تھے بہتے پانی میں ڈالا۔ سب لوگوں کے قلم پانی کے بہاؤ پر بہے مگر حضرت زکریا کا قلم الٹا اوپر کو بہا اور نہ ڈوبا تو انہوں نے حضرت مریم کی کفالت اور پرورش و پرداخت اپنے ذمہ لے لی اور ان کے قیام کے لیے ایسا بلند کمرہ تعمیر کرایا جس پر ان کے علاوہ کوئی دوسرا نہ جاتا تھا۔"

مقام ابراہیم کے بارہ میں لکھا ہے:

الحجر الذی قام علیه ابراهیم عند بناء الكعبة ليتمكن من رفع الحجارة فغاصت فيه قدماه."

(یہ وہی پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم کعبتہ اللہ کی تعمیر کے وقت اس لیے کھڑے ہوتے تھے تاکہ پتھر اٹھا سکیں۔ اس پر

ان کے قدموں کے نشانات (آگے تھے.)

اختصار کے پیش نظر نمونتہً سورۂ نساء کی پہلی آیت اور سورۂ الم نشرح کی تفسیر درج ہے تاکہ اسلوب اور مفسر کے طرز نگارش کا اندازہ ہو سکے:

سورة نساء مدنية و هي مائة و خمس و سبعون آية

بسم الله الرحمٰن الرحيم . يا ايها الناس اتقوا ربكم عقابه بان تطيعوه الذى خلقكم من نفس و احدة آدم و خلق زوجها حوامن ضلعه اليسرى و بث نشر منهما رجالا كثيرا ونساءا كثيرة . و اتقوا الله الذى تساءلون به لرسال بعضكم بعضايا سالك بالله و النشدک بالله ، اصله تتساءلون و اتقوا الارحام ان تقطعوا الله كان عليكم رقيبا حافظا و ناظراً .

سورة الم نشرح مكية وهى ثمان آيات . بسم الله الرحمٰن الرحيم الم نشرح استفهام تقرير براى شر حنالك صدرك بما اودعنا فيه من الحكم اشارة الى ماروى ان جبرئيل اتى رسول الله صلى الله عليه وسلم فى صباه فاستخرج قلبه فغسله ثم ملاؤه ايمانا و علماً و وضعنا حططنا عنك و زرك حملك الذى انقض اثقل ظهرك و هوجهله بالحكم و الاحكام و رفعنالك ذكرك بالنبوة وغيرها . فان مع العسر الشدة يسرا سهولة و ان مع العسر يسراً كرر للتاكيد فهو صلى الله عليه وسلم قاسى الشدائد من الكفار ثم نصر عليهم نصرا عزيزا و جى بلفظه مع مبالغة فى معالبة اليسر للعسر كانهما متقارنان فاذا فرغت من دعوة الحق فانصب فاتعب فى العبادة و الى ربك فا رغب تضرع بالدعا .

خط کشیدہ الفاظ کلام الٰہی ہیں اور بقیہ مفسر کی تشریحات ہیں ۔ مخطوطہ کے آخری صفحہ پر ترقیمہ کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ کاتب کا ذاتی نسخہ ہے کیوں کہ صفحہ اول پر مرقومہ تحریر المالک الحقیقی ھواللہ و بالمجاز عبدالرشید ولد دین محمد عا عند اللہ اور ترقیمہ کی عبارت ایک ہے ۔

عاجز بندہ عبدالرشید بن دین محمد غفرلہ اس تفسیر صغیر مولوی

رستم علی قنوجی کی کتابت سے ہ ذی الحجہ ۱۲۲۳ھ کو فارغ ہوا
اللہ تعالی رسول اللہ صلی علیہ وسلم اور حضرت امام حسن و امام حسین
علیہما الصلواۃ و السلام کے طفیل اس کی آنکھوں کو منور فرمائے۔
آمین

مصادر

۱- مآثر الکرام ۱ : ۲۲۱-۲۲۲۔
۲- " ۱ : ۲۵۰۔
۳- تذکرہ علمائی ھند۔ مولوی رحمن علی : ۱۳۱۔
۴- مآثر الکرام ۱ : ۲۵۱۔
۵- تذکرہ علمائے ھند : ۱۳۲۔
۶- تتمار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار : ۱۸۹۔
۷- نزھۃ الخواطر : علامہ سید عبدالحی الحسنی : ۶ : ۱۸۵۔
۸- تاریخ فرخ آباد : مولانا ولی اللہ حسینی (مخطوطہ) ۲۳۵-۲۳۶۔
۹- ابجد العلوم : نواب سید صدیق حسن خاں ۔۹۳۰-۹۳۱۔

شہنشاہ بابر اور اردو زبان

ہندوستان میں تیموری سلطنت کے بانی ظہیرالدین محمد بابر [۱۴۸۳ء -
۱۵۳۰ء] غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ مرد میدان بھی
تھے اور فنون لطیفہ کے دلدادہ بھی۔ وہ جنگجو بھی تھے اور خوش طبع
بھی۔ وہ خدا پرست بھی تھے اور منصب دوست بھی۔ وہ صحبت پسند
بھی تھے اور رومان پرست بھی۔ وہ انتظامی معاملات میں بہت سخت
تھے لیکن ان کا دل بےحد گداز تھا اور ان کی فطرت میں بڑا
لوچ تھا۔ وہ علم دوست، عمدہ مصور، علم موسیقی کے ماہر اور
ایک اچھے شاعر ہی نہیں بلکہ بہترین انشاپرداز اور شعلہ بیان مقرر
بھی تھے۔ ان کو تنقید کا شعور بھی تھا، تحقیق کا بے پایاں ذوق
تھا اور ہر چیز کی اصلیت جاننے کا شوق تھا۔ ان کو نثر و نظم
دونوں میں یکساں دستگاہ حاصل تھی۔ انھوں نے اپنے بےباک قلم سے
حقیقت نگاری کا کام لیا ہے اور اپنے عمیق قوت مشاہدہ اور تجزیہ
اور تحلیل کا ثبوت پیش کیا ہے۔

بابر ہندوستان کے پہلے حکمراں ہیں جنھوں نے ''سلطان'' کے
بجائے ''پادشاہ'' کا لقب اختیار کیا اور اہل ہند کو توپ سے روشناس
کرایا۔ انھوں نے ایک نیا رسم الخط بھی ایجاد کیا تھا جو 'خط بابری'
کہلاتا ہے[1]۔ ترکی، فارسی اور عربی تینوں زبانوں پر ان کو قدرت
حاصل تھی۔ انھوں نے خود اپنے حالات زندگی بھی نہایت اختصار
کے ساتھ اپنے ہی قلم سے ترکی زبان میں تحریر کیے تھے جو ترکی
نثر کا ایک نفیس ترین نمونہ ہے۔ اس کا اصل نام 'بابر نامہ' ہے
مگر عام طور سے ''تزک بابری'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا

---

(۱) خط بابری کا خوشنویسی سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔
یہ ایک طرح کا رسم الخط ہے اور روس کے عالم پروفیسر جانووا اور ترکی
کے پروفیسر علی الپ ارسلان نے اس رسم الخط پر تحقیقی کام کیا ہے۔

ترجمہ دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے جس میں فارسی[۱]، انگریزی[۲]، اردو[۳]، فرانسیسی[۴]، اور روسی[۵] قابل ذکر ہیں۔ بابر نے علم عروض پر بھی ایک رسالہ ترکی زبان میں "عروض رسالہ سی" تحریر کیا تھا اور حنفی فقہ سے متعلق ایک ترکی مثنوی "مبین" لکھی تھی جو ۲۰۰۰ ابیات پر مشتمل ہے۔ انھوں نے تیموریوں کے نقش بندی شیخ خواجہ عبداللہ احرار کے فارسی "رسالہ والدیہ" کا ترکی زبان میں منظوم ترجمہ بھی تیار کیا تھا جو ۲۴۳ اشعار پر مشتمل ہے[۶] لیکن ان کا "دیوان" سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس میں ساڑھے تین ہزار سے زائد ترکی اشعار شامل ہیں اور کچھ ابیات فارسی زبان کی بھی موجود ہیں۔ اس دیوان کا ایک چھوٹا سا لیکن خوش خط مخطوطہ رامپور کی رضا لائبریری میں ڈینی سن راس[۷] کو ملا تھا جو اس وقت کلکتہ کے مدرسۂ عالیہ کے پرنسپل تھے اور جو بعد میں لندن کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز[۸] کے ڈائرکٹر ہو گئے تھے۔

---

(۱) بابر نامہ کا پہلا ترجمہ شہنشاہ اکبر کے حکم سے بیرم خاں کے بیٹے عبدالرحیم خان خانان نے "تزک بابری" کے نام سے کیا تھا۔ حسن بائندہ اور شیخ زین نے بھی اس کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔

(۲) A. S. Beveridge نے براہ راست ترکی سے انگریزی ترجمہ کیا ہے مگر J. Leyden اور Erskine نے فارسی متن کو اساس بنایا ہے۔

(۳) اس کا اردو ترجمہ نصیرالدین حیدر نے کیا تھا جو پہلی بار ۱۹۲۴ء میں طبع ہوا۔ بعد میں رشید اختر ندوی نے بھی اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

(۴) فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ Pavet de Courteille نے کیا ہے۔

(۵) M. Salie نے اس کا روسی ترجمہ کیا ہے۔

(۶) مزید تفصیلات کے لیے راقم کی A Versified Treatise on Mysticism of Zahiruddin Babur دیکھیے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ادارۂ علوم اسلامیہ نے ۱۹۶۸ء میں شائع کیا ہے۔

(۷) E. Denison Ross اس وقت ہندوستان کے مختلف علمی اداروں کے سرگرم ممبر تھے۔

(۸) School of Oriental Studies کا نام اب School of Oriental & African Studies ہے۔

اس مخطوطے میں بابر کا ایک اردو شعر بھی مکتوب ہے جو اس نسخے کے ورق ۱۵ الف پر اس طرح درج ہے:

مجکا نہ سوا کچ ھوس مانک و موتی
فقر اھلیغہ بس اولغو سیدور پانی و روتی

ڈینی‌سن راس نے "دیوان" کے اس نسخے کو ۱۹۱۰ء میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال[1] کے اکسٹرا نمبر میں شائع کیا اور مذکورہ شعر کو صفحہ ۲۲ پر یوں طبع کیا:

مجکا نہ ھوا کچ ھوس مانک و موتی
فقر اھلیگا بس بولغوسی پانی و روتی

لیکن اپنے مقدمے کے صفحہ ۹ پر اس شعر کو ترکی اور اردو کا مرکب ہونے کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈینی‌سن راس نے اس کو موجودہ اردو تلفظ کے بموجب رومن رسم الخط میں بھی تحریر کیا ہے جو درج ذیل ہے:

Mujhko na hua kuch havas-i mung o moti
Faqr ahilga bas bologhusi pani o roti

اور ڈینی‌سن راس نے اس شعر کے دونوں مصرعوں کا انگریزی میں یہ ترجمہ بھی پیش کیا ہے:

I have no desire for coral or pearls ,
For faqirs (poor people) water and bread is enough .

جو اردو میں "مجھے مونگے یا موتی کی خواہش نہیں ہے کیوں کہ فقیروں کو پانی اور روٹی کافی ہے" کہا جا سکتا ہے۔

---

(۱) **Asiatic Society of Bengal** کا دفتر کلکتہ میں ہے اور اس کا کتب خانہ اب بھی بہت اہم خیال کیا جاتا ہے۔

بابر کا یہی شعر ان کے دیوان کے ایک دوسرے مخطوطے میں بھی مکتوب ہے جو آج کل استانبول یونیورسٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہے اور جس کو ترکیات کے بین الاقوامی شہرت کے مالک پروفیسر فواد کوپرولو نے تلاش کیا اور اس کے ترکی اشعار پر علمی و تحقیقی کام کیا[۱]۔ یوں تو اس مخطوطے کے فارسی اشعار پر ہمارے پروفیسر سید نعیم الدین صاحب نے بھی کام کیا ہے[۲] لیکن بابر کا اردو شعر ان دونوں حضرات کی توجہ کا محتاج ہی رہا۔ راقم کے پاس اصل مخطوطے کا روٹوگراف موجود ہے جس کے ورق ۸۸ الف کا یہ بارھواں شعر ہے جو اس طرح درج کیا گیا ہے:

مجکا نہ ہوا کچ ہوس مانک و موتی
فقر اهلی غه بس لولغوسی دور پانی و روتی

اور راقم نے اس کو اس طرح پڑھنے کی کوشش کی ہے:

مج کا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی
فقر اهلیغه بس بولغوسی دور پانی و روتی

بابر کے اس شعر کو متعدد بار اردو ادب کی تاریخ کی کتابوں میں بھی نقل کیا گیا تھا مگر ترکی زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے صحت برقرار نہیں رہ سکی ہے۔ خود ڈینی سن راس سے بھی اس کے پڑھنے اور سمجھنے میں غلطی ہو گئی ہے۔ انھوں نے اصل نسخے کے لفظ "مانک" کو "مونگ" بمعنی مونگا (Coral) سمجھا ہے جب کہ دونوں مخطوطوں میں "مانک" صاف صاف تحریر ہے اور جو خود بامعنی لفظ بھی ہے۔ یہ لفظ "لعل" کا مترادف ہے چنانچہ لفظ "مانک" کے "ک" کو "گ" قرار دینے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اسی طرح ڈینی سن راس نے "اهلیغه" کو "اهلیگا"

---

(۱) دیکھئے رسالہ Milli Tetebbuler Mejmuasi کا نمبر ۱ تا ۴۔

(۲) دیکھئے رسالہ Islamic Culture کی جلد ۳۰، شمارہ ۱، صفحہ ۴۳ تا ۵۰۔

قرار دیا ہے جب کہ ''غہ'' چغتائی ترکی زبان میں "کو" "کے" ''لیے" کی علامت ہے۔ اسی طرح سے لیفٹیننٹ راس نے "بولغوسیدور" کو صرف ''بولغوسی" لکھا ہے اور لفظ ''دور" غائب کر دیا ہے جس کے معنی ''ہے" کے ہیں۔ خود راقم نے بھی ''محکا" کو ''مجکا" یا "مج کا'' پڑھا ہے جو ہر لحاظ سے ''مجھ کو'' کا مترادف ہے۔ اس طرح سے بابر کے اس اردو شعر کی قرأت یوں ہونی چاہیے:

مجکا نہ ہوا کچ ہوس مانک و موتی
فقر اہلیغہ بس بولغوسی دور پانی و روتی

اور اس شعر کا اردو میں منظوم ترجمہ اس طرح کیا جا سکتا ہے:

مجھ کو نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی
لازم ہے فقیروں کو فقط پانی و روٹی

ڈاکٹر اکمل ایوبی*

---

* پروفیسر اکمل ایوبی، سابق صدر و سابق ڈائرکٹر، شعبہ و ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

فہرست اردو مطبوعات

ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۱ - ہندوستان میں عربی ادب اور علوم اسلامیہ کی تدریس و تحقیق — از ڈاکٹر عبد العلیم — قیمت Re. 1.00

۲ - جدید فارسی شاعری — از ڈاکٹر منیب الرحمٰن — قیمت Rs. 3.00

۳ - ترکی — از ڈاکٹر اکمل ایوبی — قیمت Rs. 7.00

۴ - عراق — از ڈاکٹر محمود الحق — قیمت Rs. 7.00

۵ - عبد الرحمن الکواکبی — از ڈاکٹر محمود الحق — قیمت Rs. 25.00

۶ - ابن الفارض — از ڈاکٹر غلام مصطفی — قیمت Rs. 25.00

۷ - اصول فہرست نگاری — از محمود الحسن قیصر — قیمت Rs. 20.00

۸ - جدید تاجیک شعرا — از ڈاکٹر کبیر احمد جائسی — قیمت Rs. 60.00

۹ - فارسی قصیدہ نگاری — از ڈاکٹر نذیر احمد — قیمت Rs. 45.00

۱۰ - علوم اسلامیہ اور ہندوستانی علماء — از ڈاکٹر محمد سالم قدوائی — قیمت Rs. 60.00

۱۱ - چند ایران شناس — از ڈاکٹر کبیر احمد جائسی — قیمت Rs. 80.00

۱۲ - افکار و احوال — از ڈاکٹر محمد سالم قدوائی — قیمت Rs. 80.00

ملنے کا پتہ

PUBLICATIONS DIVISION
Aligarh Muslim University
Aligarh—202001

عہد عباسی کے چند ائمۂ علم و فن

مصنف : ڈاکٹر تنویر عالم فلاحی۔ طابع : اوروا پرنٹنگ پریس، دہلی۔ کتابت، طباعت و کاغذ : اوسط۔ قیمت : عام ایڈیشن تین روپیہ مگر لائبریری ایڈیشن ساٹھ روپیہ۔ صفحات : ۱۵۸

عہد عباسی علوم و فنون کی ترویج و ترقی کے لیے بڑی شہرت رکھتا ہے اور یہ شہرت محض کاغذی یا زبانی نہیں ہے۔ خود علوم و فنون اس کے گواہ ہیں کہ اس دور کے لوگوں نے کس طرح ان کی پذیرائی کی، اس عروج و ترقی کی داستانیں آج بھی سرزمین عرب کے بہت سے علاقوں میں کندہ نظر آتی ہیں۔ عربوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے مزاج، عادات و اطوار اور صلاحیتوں میں بڑی تیزی سے تبدیلی پیدا کی، ان کے ذہن اسلام ہی کی طرح سے وسیع اور آفاقی ہو گئے، اور ہر شعبہ زندگی میں انھوں نے بےمثال کام انجام دیئے۔ قرآن مجید اور احادیث رسول ان کے لیے سر چشمۂ زندگی تھے اور جو اشارے ان کو یہاں ملے ان کو انھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیا۔ علم کی طرف دعوت، فکر و فن کی ترغیب، بے لوث کام کرنے کی لگن، اللہ کی ودیعت کی ہوئی عقل کا صحیح استعمال اور ذہنی صلاحیتوں کو عمل میں لاکر انھوں نے علم و ادب کی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا۔

عباسی دور میں مسلمانوں کی حکومت دنیا کے بڑے حصہ پر قائم ہوئی اور تہذیب و تمدن اور علوم و فنون میں غیرمعمولی ترقی ہوئی۔ عربوں کی علمی پیاس اور دانائی نے ہر جگہ ان کے کردار اور شخصیت کو نمایاں رکھا، انھوں نے ہر جگہ نئے اور اہم علوم میں اس طرح مہارت حاصل کی کہ وہاں کے لوگ بھی دنگ رہ گئے اور ان کے قائل ہوئے۔ عباسی دور کے بہت سے خلفاء خود اچھے عالم اور ادیب تھے، ان کو علم و فن سے لگاؤ تھا اور علماء و

مفکرین فن کی عزت افزائی، قدردانی اور سرپرستی کرنا باعث فخر سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں جو علمی و ادبی ترقی ہوئی اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

زیر نظر کتاب اسی عباسی دور سے تعلق رکھتی ہے۔ ڈاکٹر نوشیر عالم مدرسۃ الفلاح کے فارغ ہیں، عصری علوم سے دلچسپی ان کو علی گڑھ لائی اور یہاں انھوں نے عربی میں ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کیا اور اسلامی علوم و عربی ادب کو اپنا علمی میدان بنایا۔ علی گڑھ کی فضاء نے ان میں تجدد کی لہر پیدا کی اور موجودہ دور کے تقاضوں کو سمجھنے میں مدد کی۔ ان کی یہ کتاب ان کی علمیت اور ذہنیت کی عکاس ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے عباسی دور کے چار اہم کاملین ادب کا تعارف کرایا ہے اور ان کے فکر و فن کا تجزیہ کیا ہے۔ کتاب کو پانچ ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں عباسی دور کے ادب، علمی ترقی اور زبان کا اجمالی تعارف کرایا ہے۔ اس سے اس دور کے اہم علوم و فنون کے ساتھ ساتھ علماء و ادباء کے اہم کارناموں کا سرسری جائزہ بھی سامنے آجاتا ہے۔ ان کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ "عہد عباسی کے علمی کارناموں کا جائزہ لیتے وقت یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ علم و فن کی وہ کون سی شق ہے جو اپنے اندر انفرادیت کی شان نہیں رکھتی ہے۔ در اصل قرآن، حدیث، فقہ، نحو، علم لغت، علم بیان، تاریخ و جغرافیہ، فلسفہ اور طب یہ تمام ایسے موضوعات ہیں جن پر عباسی کاروان علم نے فکر و خیال کا سرمایہ لٹایا اور انہیں نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔"

دوسرے باب میں انھوں نے عبداللہ بن المقفع کی زندگی کے حالات بیان کئے ہیں اور اسکی علمی و ادبی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اس کی فکر کا بھی جائزہ لیا ہے۔ اس کے مذہبی عقائد و خیالات کا تنقیدی تجزیہ کیا ہے، اس کے بعد اس کی ادبی اور علمی سرگرمیوں کی نشاندہی کی ہے اور اس کے تراجم بالخصوص کلیلہ و دمنہ پر تفصیلی بحث کی ہے۔

تیسرے باب میں انھوں نے جاحظ کے حالات زندگی اور اس کی ادبی خدمات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ عربی ادب میں جاحظ نے اپنی خداداد ذہانت سے وہ مقام حاصل کیا جو اس دور کے کسی دوسرے ادیب کو نہ مل سکا، اس کی برجستہ تحریریں، بے ساختہ جملے اور مستحکم انداز بیان نے عام طور سے لوگوں کو متاثر کیا ہے۔ "کتاب الحیوان" اور "کتاب البخلاء" جاحظ کی وہ کتابیں ہیں جو اس کے انداز بیان و انداز فکر کی آئینہدار ہیں اور جن میں وہ ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی بنیاد پر بہت سی ایسی باتیں کرتا ہے جو ہماری روزمرہ کی زندگی میں پیش آتی ہیں اور جن کو اہمیت نہیں دیتے لیکن جب وہی بات اس کی تحریر کی شکل میں ہماری نظر سے گذرتی ہے تو ہمارا ذہن کسی اور طرح سے سوچنے لگتا ہے۔

چوتھے باب میں ابن قتیبہ اور اس کی مشہور تصنیف "ادب الکاتب" کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ ابن قتیبہ تیسری صدی ہجری کا ایک بہت ہی اہم عالم ہے۔ مشکل القرآن، عیون الاخبار، کتاب الاشربۃ اور کتاب الشعر و الشعراء جیسی تصانیف اس کو ایک مورخ، مفکر، فقیہ اور مفسر کے زمرہ میں شامل کرتی ہیں۔ اس کی تمام تصانیف میں اس کا اپنا ادبی رنگ نمایاں ہے اور یہی اس کی انفرادیت ہے جو اسے اس دور کے دوسرے لوگوں سے ممتاز کرتی ہے۔ اس کی "ادب الکاتب" مختلف علوم و فنون کے ساتھ ساتھ لسانیات کی انسائیکلوپیڈیا ہے، اس میں صرف و نحو اور علوم لغت کے ساتھ ساتھ فلکیات تقویم البلدان وغیرہ جیسے علوم سے بھی بحث کی گئی ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کا مطالعہ عربی زبان و ادب کے تمام طالبعلموں کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ مصنف نے اس کتاب کا بھرپور تفصیلی تعارف کرایا ہے اور اس کی اہمیت و افادیت کی وضاحت کی ہے۔

پانچویں باب میں سیبویہ اور اس کی "الکتاب" کا تذکرہ ہے۔ سیبویہ عباسی دور کے ان اہم لوگوں میں سے ہے جس نے لغت اور اس کے قواعد کی تدوین کی اہمیت اور ضرورت کو محسوس کیا۔ عربوں کی بڑھتی ہوئی فتوحات اور دنیا کی مختلف قوموں سے ان کے ربط و ضبط کی وجہ سے اس بات کی ضرورت تھی کہ علم نحو اور

لغت کی طرف توجہ کی جائے تاکہ زبان و ادب کو آلودگیوں سے بچایا جا سکے۔ یہ تصنیف ہر اعتبار سے مکمل و منظم ہے اور اس نے وقت کی اہم ضرورت کو پورا کیا۔ سیبویہ ایک عالم بھی تھا اور اس لحاظ سے اس کو دوسرے علوم و فنون سے بھی شغف تھا اور یہی وجہ ہے کہ لوگ اس کے علم، پرکھ اور سوجھ بوجھ کے قائل تھے اور اس کی عزت کرتے تھے۔ سیبویہ مناظروں میں بھی حصہ لیتا تھا اور اسے اس فن میں مہارت حاصل تھی مگر یہاں بھی اس کا رنگ علمی ہوتا تھا۔

ڈاکٹر توقیر عالم نے یہ کتاب پیش کر کے عربی نثر کے چار اہم اساطین کا اردو والوں سے تعارف کرایا ہے۔ ان کی یہ کوشش قابل قدر ہے۔ ان چاروں ادیبوں کا مطالعہ کرنے سے اس دور کی بہت سی لیچلیوں اور علوم و فنون سے خاص واقفیت ہو جاتی ہے۔ یہ کتاب ایک بڑی ادبی خدمت ہے۔ مصنف نے بعض اختلافات کی بھی وضاحت کی ہے، لیکن اس بات کا خیال رکھا ہے کہ ان کی تصنیف کسی بحث کا موضوع نہ بنے۔ اسی لیے بہت سادہ اور سلیقے انداز سے ان لوگوں کے حالات اور تصانیف وغیرہ کا تعارف کرایا ہے۔ اپنی باتوں میں وزن پیدا کرنے کے لیے ہر جگہ حوالے دئے ہیں جن میں قدماء اور متاخرین دونوں ہی کی تصانیف شامل ہیں توقیر صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک اہم او ضروری کام کیا ہے۔ عربی ادب سے شغف رکھنے والوں اور طالبعلموا کے لیے یہ کتاب بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ عباسی دور کے علوم و فنون اور ثقافت سے متعلق بیشتر کام انگریزی یا عربی میں ہیں اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ایسے اور بھی کام کئے جائیں تاکہ اردوداں حضرات بھی فائدہ اٹھا سکیں۔

ڈاکٹر محمد سالم قدوائی*

---

* پروفیسر محمد سالم قدوائی، صدر و ڈائیرکٹر، شعبہ و ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

VOLUME 18 NUMBER 1 & 2

MAJALLA-I 'ULUM-I ISLĀMIYA

1993

Editors

Prof. N. AKMAL AYYUBI

Prof. KABIR AHMAD JAISI

Prof. M. SALIM KIDWAI

Published by

THE INSTITUTE OF ISLAMIC STUDIES

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

ALIGARH—202002

INDIA